ڈاکٹر حافظ انس نضر[1]

علوم عربیہ سے استفادہ میں افراط و تفریط اور راہِ اعتدال

Abstract

A Radical Approach in Employing Arabic Sciences and a Moderate Approach Mawlānā Hamīd al-Dīn Farāhī has given Arabic language a significant importance in the exegesis (Tafsīr) of Qur'ān. He deems pre-Islamic Arabic literature to be the founding principle in determining the Qur'ānic exegesis. In this treatise, a critical and an analytical study has been presented of Al-Farāhī's principle of Exegesis with regards to Arabic language. According to Ahl al-Sunnah wa al-Jamā'ah pre-Islamic Arabic literature is undoubtedly one of the sources to determine the exegesis but it is not the founding principle for its interpretation. Therefore, if an inconformity arises in between the linguistic interpretation (Tafsīr al-Lughawī) and that which is traditionally transmitted (Tafsīr bil-Ma'thūr), then the latter would have precedence over the former. On the contrary, Al-Farāhī believes that the meaning which is determined by the linguistic principles is more reliable than that which is transmitted in form of traditions.

قرآنِ کریم کی زبان عربی ہے اور عربی بھی وہ جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ جنّ و بشر میں سے کسی کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے کہ اس کی مثل کلام پیش کر سکے۔ شعرائے سبعہ معلقہ میں لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ آخری شاعر ہیں۔ ان کے ایک شعر پر عکاظ میں تمام شعرائے وقت نے ان کو سجدہ کیا اور

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، دی یونیورسٹی آف لاہور، لاہور

عرب کی روایت کے مطابق اعزاز کے طور پر ان کا قصیدہ خانہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا۔ یہ لبید بعد میں مسلمان ہو گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے شعر کہنا ترک کر دیا۔ جو شاعر تمام عرب شعراء کا مسجود، وقت کا ملک الشّعراء اور عرب کی فصاحت وبلاغت کا مظہر کامل ہو، اس کے ترکِ شعر پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کسی نے پوچھا کہ اب آپ شعر نہیں کہتے؟ جواب میں انہوں نے فرمایا: "أبعد القرآن؟"[1] کہ کیا قرآن کے نازل ہو جانے کے بعد بھی اس کیلئے کوئی گنجائش باقی ہے؟

قرآن مجید کے اعجاز بلاغت کے آگے سر افگندگی کا یہ اظہار واعتراف اس عظیم شاعر کی طرف سے ہے جو اپنے زمانے میں عرب کی تمام فصاحت وبلاغت کا نشان وعلم تھا۔ جب وہ اس طرح قرآن کے آگے سر بسجود ہو گیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عرب کی تمام فصاحت وبلاغت نے قرآن کی فصاحت وبلاغت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کے بعد کسی اور کیلئے قرآن کے آگے نگاہیں اونچی کرنے کا کیا امکان باقی رہا؟

اس درجے ومرتبے کے کلام کے زور واثر اور اس کی خوبیوں کا اگر کوئی شخص اندازہ کرنا چاہے تو یہ کام ظاہر ہے کہ وہ صرف اس کے ترجمہ، تفسیر اور اس کے لغتوں کے ذریعے سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کیلئے اس کو اس زبان کا ذوق پیدا کرنا پڑے گا، جس میں وہ کلام ہے۔ کسی کلام کا ذوق پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کیلئے فطری رجحان طبیعت اور لطافت ذوق کے ساتھ ساتھ اس زبان کی مشق وممارست ناگزیر ہے۔ برسوں کی محنت کے بعد کہیں آدمی میں کسی زبان کا ذوق پیدا ہوتا ہے اور اگر زبان اپنی مادری زبان نہ ہو تو یہ مشکل دوچند ہو جاتی ہے۔

تفسیر قرآن بذریعہ ادبِ جاہلی

مولانا فراہیؒ عربی لغت واسالیب سے واقفیت واستفادہ پر زیادہ زور دیتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ واسالیب بعینہٖ آج بھی وہ ہیں جن پر وہ نازل ہوا ہے۔ یہ بات معلوم ہے کہ قرآن مجید کا نزول عرب کی اس ٹکسالی زبان میں ہوا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت عرب میں جاری وساری تھی۔ اس لئے قرآن کے اسالیب، اس کے اشارات و تلمیحات اور تعریضات وکنایات کو سمجھنے میں صرف عربی زبان ہی معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ عرب کے معروف ومنکر، ان کی معاشرتی زندگی کی خصوصیات، ان کی سوسائٹی میں خیر وشر کے معیارات، ان کے سماجی تمدّنی اور سیاسی نظریات، روزمرہ کی زندگی میں ان کی دلچسپیاں اور مشاغل، ان کے مذہبی رسومات ومعتقدات غرض ان کی ساری چیزوں کو سمجھنے میں عربی زبان سے زیادہ بہتر ماخذ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کلامِ عرب سے استشہاد اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے تاریخی جملہ " الشّعر ديوان العرب"[2] سے بھی اس کی

---

[1] امین احسن اصلاحی، مولانا، تدبّر قرآن: 1/ 14، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1999ء

[2] الزركشي، أبو عبد الله بدر الدين، البرهان في علوم القرآن: 1/ 294، دار إحياء الكتب العربية، الطبعة الأولى، 1957م

اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کو دورِ جاہلیت کے شعری ونثری سرمایہ سے کافی دلچسپی تھی اور ان سے انہوں نے اپنی تفسیر میں استشہاد بھی خوب کیا ہے۔ وہ کہیں عربی لغت کی کسی کتاب کا حوالہ دیتے نظر نہیں آتے اور ابن منظور رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 711ھ) کی لسان العرب اور جوہری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 393ھ) کی الصحاح کے سوا کسی کو بطور مرجع استعمال کرتے دکھائی نہیں دیتے لیکن جاہلی اشعار سے استشہاد اور مفہوم کی تعیین میں ان سے مدد لینا مولانا کے منہج تفسیر کا نمایاں پہلو ہے۔

مثال کے طور پر آیتِ کریمہ ﴿إِنْ تَتُوبَآ إِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾[1] میں 'صغو' کے معنی عام مفسرین نے منحرف ہونا، حق سے پھرنا اور نافرمانی کرنا کئے ہیں لیکن مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ اسے " أنابت قلوبكما ومالت إلى الله ورسوله "کہ تم دونوں کے دل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھک گئے ہیں، کے معنیٰ میں لیتے ہیں پھر وہ لفظ "صغو" کی لغوی تحقیق کرتے ہیں اور اس کے تمام مشتقات میں اس مفہوم کی موجودگی سے استدلال کرتے ہیں[2] اور آخر میں کلامِ عرب سے بطور دلیل اشعار پیش کرتے ہیں۔

ابن بری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1187ھ) نے "الإصغاء بالسّمع" "کسی کی طرف کان لگانا۔" کے ثبوت میں شاعر کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے:

تَرَى السَّفِيهَ بِهِ عَن كُلّ مَكْرُمَةٍ زَيْغٌ وفِيهِ إِلَى التَّسْفِيهِ إِصْغَاء[3]

"نادان انسان کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عزت وشرف کی ہر بات سے منہ موڑتا ہے اور سفاہت کی باتوں کی طرف کان لگاتا ہے۔"

ذوالرّمہ اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے:

تُصْغِي إِذَا شَدَّهَا بِالكُورِ جَانِحَةً حَتّى إِذَا مَا اسْتَوَى فِي غَرْزِهَا تَثِبُّ[4]

"جب وہ اس پر کجاوہ کستا ہے تو وہ گردن موڑ کر کان لگاتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے رکاب میں پاؤں رکھ دیتا ہے تو وہ جھپٹ پڑتی ہے۔"

---

[1] سورة التحريم: 66 : 4

[2] الفراهي، حميد الدين، أبو أحمد عبد المجيد، تفسير نظام القرآن وتأويل الفرقان بالفرقان: ص198، الدائرة الحميدية، الهند، الطبعة الأولى، 2008م

[3] الأفريقي، محمد بن مكرم بن علي، لسان العرب: 14/ 461، دار صادر، بيروت، الطبعة الثالثة، 1414هـ

[4] القرطبي، أبو عبد الله محمد بن أحمد، الجامع لأحكام القرآن: 7/ 69، دار الكتب المصرية، القاهرة، الطبعة الثانية، 1964م

اعشیٰ (متوفیٰ 83ھ) اپنے کتے کی آنکھ کا ذکر کرتا ہے:

تَرَى عَيْنَهَا صَغْوَاءَ فِي جَنْبِ مُؤْقِهَا تُرَاقِبُ كَفِّي وَالْقَطِيعَ الْمُحَرَّمَا[1]

"اس کی آنکھ گوشۂ چشم کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے اور وہ میری ہتھیلی اور مضبوط بٹے ہوئے کوڑے کو دیکھتی ہے۔"

لغت کی جن کتابوں سے مولانا نے استفادہ کیا ہے وہ بھی ناقدانہ نوعیت کا ہے۔ وہ مقلدِ اعمیٰ بن کر کسی چیز کو بھی قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ "لسان العرب" جس سے مولانا نے خاص استفادہ کیا ہے اور جس کا حوالہ کافی ملتا ہے اس پر اور اس جیسی لغات پر مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا تبصرہ یہ ہے:

"فأما في سائر الألفاظ وأساليب حقيقتها ومجازها فالمأخذ فيه كلام العرب القديم والقرآن نفسه، وأما كتب اللغة فمقتصرة، فإنها كثيرا ما لا تأتي بحدّ تام، ولا تميز بين العربي القح والمولد، ولا تهديك إلى جرثومة المعنى فلا يدري ما الأصل، وما الفرع؟ وما الحقيقة وما المجاز؟ فمن لم يمارس كلام العرب واقتصر على كتب اللغة ربما لم يهتد لفهم بعض المعاني من كتاب الله. ومن كلام العرب القديم الذي وصل إلينا ما هو منحول، وما هو شاذ، ولكن لا يصعب التمييز بين المنحول والصحيح على الماهر الناقد. فينبغي لنا أن لا نأخذ معنى القرآن إلا مما ثبت."[2]

"دوسرے الفاظ (یعنی اصطلاحی الفاظ کے علاوہ عام عربی الفاظ) اور حقیقت ومجاز کے مختلف اسلوب تو اس باب میں ماخذ قدیم کلامِ عرب اور خود قرآنِ مجید ہے۔ لغت کی کتابیں ان چیزوں کی تحقیق میں کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں۔ ان سے بالعموم نہ تو الفاظ کی پوری حقیقت معلوم ہوتی ہے، نہ عربی خالص اور عربی مولد کے درمیان کوئی امتیاز ہوتا ہے اور نہ ہی لفظ کی اصل کا پتہ چلتا ہے کہ معلوم ہو سکے کہ کیا اصل ہے اور کیا فرع، حقیقت ہے یا مجاز؟ جو لوگ کلامِ عرب میں مہارت بہم نہیں پہنچاتے بلکہ صرف لغت کی کتابوں پر قانع رہ جاتے ہیں وہ بعض اوقات قرآن کے معنی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ پھر قدیم کلامِ عرب کا جتنا حصہ ہم تک پہنچا ہے، اس میں بہت کچھ ملاوٹ بھی ہے اور غریب و نامانوس الفاظ کی بھی اس میں آمیزش ہے لیکن ایک ناقد وماہر کیلئے اصل و نقل میں امتیاز کرنا کچھ مشکل نہیں پس ضروری ہے کہ تفسیر قرآن میں صرف وہ معنی لیے جائیں جو اصل کلامِ عرب سے ماخوذ ہوں۔"

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

"وكتب اللغة والغريب لا تعطيك حدودَ الكلمات حدًّا تامًّا، وكتب السّير والتّفسير لا تُبيّن لك بالتّمام والصّحة أمورًا جاء ذكرُها في القرآن. وكتب العلوم الأخر من العقليّات والأخلاق لا

[1] لسان العرب: 8/ 28

[2] تفسير نظام القرآن: ص32

تُعطيك ما تضمَّن عليه القرآن من الحكم والأسرار. فاحتَجنا إلى ثلاثة علوم: اللغة والتاريخ والحكمة، ومن أراد التأمل الصّحيح والتّدبّر التّام وجب عليه أن لا يغفُل عن التنقيد فيما يأخذه من هذه العلوم كلّها. ومن يتمسّك بالقرآن، وينوّر الله عقله به، يطّلع على أغلاطٍ كثيرة في كتب القوم، والضرر يكون بقدر الاعتماد عليها والغفلة من التنقيد ومضرة كتب الفلسفة أضل وأوغل. فإن معظم القرآن الحكمةُ، وهي الأصل، ولا سبيل إلى فهمها من القرآن دون الاطّلاع على معاني كلماتها المفردة ودون العلم بصحيح علوم اللسان من البيان الحافل بدلائل."[1]

"لغت اور غریب کی کتابوں میں ہمیں کلمات کے حدود وقیود کی مکمل تصویر کشی نہیں ملتی۔ سیر اور تفسیر کی کتابیں قرآن کے بیان کردہ مفاہیم سے ہمیں کلی طور پر روشناس نہیں کراتیں، اسی طرح اخلاق اور فلسفہ کی کتابیں قرآنِ کریم کے جملہ اسرار ورموز کی نقاب کشائی سے قاصر ہیں۔ اس لئے ہمیں لغت، تاریخ اور حکمت تینوں کی بیک وقت ضرورت ہے۔ اور جو شخص قرآن سے وابستہ رہے، اور اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے اس کے دل ودماغ کو روشن کردے تو ایسے لوگوں کی تصنیفات میں خاص طور پر فلسفہ کی کتابوں میں بے شمار لغزشیں اور گمراہ کن باتیں نظر آئیں گی۔ قرآن کریم سراپا علم وحکمت اور اصل واساس ہے۔ اس کے علوم ومعارف کی تہہ تک رسائی حاصل کرنے کیلئے مفردات قرآنی اور علومِ لسانی سے خاطر خواہ واقفیت ناگزیر ہے۔"

فنِ نحو، منطق، علم البیان، فنِ بلاغت، اصول فقہ اور دوسرے فنون کے سلسلہ میں بھی مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطہ نظر یہی ہے کہ یہ سب مختلف پہلوؤں سے تشنہ اور اصلاح وترمیم یا تدوینِ نو کے محتاج ہیں، تب کہیں جاکر ان سے تفہیم وتوضیحِ قرآن میں مدد لی جاسکتی ہے۔ لغات کی اہمیت بس یہ ہے کہ ان میں استعمالات اور شواہد ونظائر سے اکثر لفظ کے مختلف پہلو واضح ہوجاتے ہیں، لیکن قرآن کے اصل مدّعا کو سمجھنے کیلئے دوسری چیزوں کی ضرورت زیادہ ہے۔ "لسان العرب" وغیرہ میں اہلِ تاویل کے مختلف اقوال کا نقل کردیا جانا کوئی خاص اہمیت کی چیز نہیں ہے اور اس سے حلِ مشکلات میں بہت زیادہ مدد نہیں ملتی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"وأما باقي علوم اللسان كالنحو والمنطق والأصول والبيان والبلاغة والقافية فالكتب المدوّنة فيها ـ مع كثرة فوائدها ـ أشد تقصيرًا من كتب اللغة لفهم القرآن."[2]

"اور باقی لسانی علوم جیسے نحو، منطق، اصول، بیان، بلاغہ اور قافیہ وغیرہ میں مدون کتب ـــ اپنے متعدد فوائد کے باوجود فہم قرآن کے سلسلے میں کتب لغت سے بھی زیادہ قاصر ہیں۔"

---

[1] الفراهي، حميد الدين أبو أحمد، مفردات القرآن: ص 98، الدائرة الحميدية، مدرسة الإصلاح، سرائي مير أعظم كرهـ الطبعة الثانية، 2004م

[2] مُفردات القرآن: ص98

انہی وجوہات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنی لغت پر ایک رسالہ "مفردات القرآن" مرتّب کیا جس میں 77 قرآنی الفاظ کی تحقیق و تشریح عربی اشعار اور قرآنی استعمالات کو سامنے رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ ناتمام رہی، تاہم مولانا عبدالاحد اصلاحی نے دائرہ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڑھ سے شائع کر دیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی کی تشریح و تحقیق کے ساتھ دار العرب الاسلامی بیروت سے بھی 2002ء میں بڑی نفاست اور اعلیٰ معیار کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر قرآن میں عربی زبان و ادب کو کلیدی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مفسر قرآن کیلئے ادبِ جاہلی سے واقفیت انتہائی ضروری ہے۔ اگر مفسر، تفسیر قرآن میں ادبِ جاہلی کو ملحوظ نہ رکھے تو بیشتر مقامات پر قرآن کے صحیح معنی و مفہوم کی وضاحت سے قاصر رہے گا، جس سے بہت سی خرابیاں لازم آئیں گی۔ جہاں تک قدیم جاہلی ادب کے مستند ہونے کا تعلّق ہے، تو اس سلسلے میں مولانا رقمطراز ہیں:

"كما أن الله تعالى وعد أن يحفظ متن القرآن العظيم، حيث قال: ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ فكذلك وعد ببيانه حيث قال: ﴿ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ ﴾ فمن بعض إنجاز وعده أنه حفظ اللسان العربي من الاندراس والمحو، وجعله حيّا باقيًا."[1]

"جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ وہ متنِ قرآن کی حفاظت کرے گا: ﴿ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ إِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ کہ ہم نے ذکر کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اسی طرح اس کی تشریح و بیان کا بھی وعدہ فرمایا ہے: ﴿ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ ﴾ کہ پھر ہمارے ذمے ہے اس کی وضاحت کرنا۔ چنانچہ یہ اسی وعدہ کا ایفا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی زبان و ادب کو مٹنے سے محفوظ رکھا ہے اور اس کو ایک زندہ و قائم زبان بنا دیا ہے۔"

مفرداتِ قرآنی کی تحقیق

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے "مفردات القرآن" لکھی تو اس میں ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ قدیم کلامِ عرب اور قرآنی استعمالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نمونے کے کچھ اہم اور مخصوص مفردات کی تحقیق و تشریح کی جائے۔ الفاظ کی اصل کا سُراغ لگایا جائے، ان کی روح کو سمجھنے اور باریکیوں اور لطافتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی جائے اور عام اہلِ لغت کی طرح محض کسی لفظ کے بہت سے معانی یکجا کر دینے پر اکتفاء نہ کیا جائے، بلکہ الفاظ و لغات سے متعلّق کچھ ایسی اُصولی بحثوں سے روشناس کرایا جائے جن سے بخوبی معلوم ہو سکے کہ الفاظ کی تحقیق کس انداز سے ہونی چاہئے؟ اور بحث و تحقیق کے کیا اُصول ہمارے پیشِ نظر رہنے چاہئیں؟ مولانا "مفردات القرآن" کے مقدّمہ میں

[1] تفسیر نظام القرآن: ص 31

رقمطراز ہیں:

"ولا نُورد في هذا الكتاب من الألفاظ إلا ما يقتضي بيانًا وإيضاحًا، إما لبناء فهم الكلام أو نظمه عليه، فإن الخطأ ربما يقع في نفس معنى الكلمة، فيُبْعِد عن التأويل الصّحيح، أو في بعض وجوهه، فيُغْلِق بابَ معرفة النّظم. وأما عامّة الكلمات فلم نتعرّض لها، وكتب اللّغة والأدب كافيةٌ به."[1]

"اس کتاب میں ہم صرف انہی الفاظ و کلمات کو موضوع بحث بنائیں گے، کلام کا نظم و ربط جن کی تشریح و توضیح کا متقاضی ہو، کیونکہ غلطی بعض اوقات نفس کلمہ کے معنی میں واقع ہوتی ہے تو صحیح تاویل سے دور کر دیتی ہے یا بعض اوقات اس کی مختلف وجوہ میں ہوتی ہے تو نظم کی معرفت کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ جہاں تک باقی عام کلمات کا تعلّق ہے، تو ان سے ہم کوئی تعرض نہیں کریں گے، لغت و اَدب کی کتابیں ان کیلئے کافی ہیں۔"

مگر چونکہ یہ کتاب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکی، اس لئے محض اس کتاب کی بنیاد پر مفردات کی تحقیق میں مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے مکمل طریقہ کار کی نشاندہی کرنا علمی حق تلفی کے مترادف ہے۔[2] مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مفردات القرآن" اور ان کی دیگر تصنیفات کی روشنی میں ان بعض رہنما اُصولوں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جنہیں مولانا نے مفرداتِ قرآنی کی تحقیق میں پیش نظر رکھا ہے:

وہ مفردات کی تحقیق میں محض لغت و تفسیر کی کتابوں کی نقل و حکایت اور ان کے بیان کردہ معانی کی تلخیص و تفصیل پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ لفظ کو اس کے اصل منبع و مرجع یعنی خود قرآن کریم اور پھر کلامِ عرب کی کسوٹی پر رکھتے ہیں کیونکہ قرآنِ کریم خالص عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور زبان بھی وہ جو فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزے کی حد کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ جاننے کیلئے کہ لفظ کا صحیح استعمال کیا ہے؟ اور نزولِ قرآن کے وقت بالضّبط اس کا کیا مفہوم تھا؟ کلامِ عرب کی طرف رجوع نہایت ضروری ہے۔

اگر کسی لفظ کا صحیح معنی متعین نہ ہو سکے تو اس کی توضیح و تفسیر کا طریقہ یہ ہے کہ عربی زبان سے مشابہت رکھنے والی عبرانی و سریانی زبانوں میں اس لفظ کا استعمال معلوم کیا جائے اور اس کی روشنی میں اس کا صحیح مفہوم متعین کیا جائے۔ عربی اور عبرانی زبان میں جو مماثلت پائی جاتی ہے اس بارے میں مولانا لکھتے ہیں:

"فاعلم أن كلام المسيح المروي باللّغة اليونانية أصله عبراني. فلغة الإنجيل وكتب العهد العتيق واحدة، ولا شكّ أن العربي والعبراني - وهما لغتا الكتب المنزّلة - صنوان. إذا كان الأمر هكذا لا بدّ أن تشبّه بعضها بعضا، أو تهدي إحداهما إلى معنى الأخرى."[3]

---

[1] مفردات القرآن: ص93

[2] أيضًا: ص54

[3] تفسير نظام القرآن: ص36

"یہ معلوم ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کا کلام جس کی روایت یونانی زبان میں ہوئی، دراصل عبرانی زبان میں تھا، انجیل اور تورات کی زبان ایک ہی ہے۔ اور یہ اَمر بھی ہر شخص کو معلوم ہے کہ عربی اور عبرانی - جو آسمانی کتابوں کی زبانیں ہیں - دونوں ایک ہی اصل سے نکلی ہیں۔ ایسی صورت میں ناگزیر ہے کہ ان دونوں میں نہایت گہری مماثلت ومشابہت ہو اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے معانی کی طرف رہبری کرے۔"

قرآنِ مجید عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ اس کی زبان فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسی طرح اس کے معانی ومطالب میں بھی غایت درجہ بلندی پائی جاتی ہے۔ جو کلام ان خصوصیات کا حامل ہو وہ فصیح، معروف اور واضح الفاظ کو چھوڑ کر شاذ، منکر اور غریب الفاظ کا استعمال کیونکر کر سکتا ہے؟ اس لیے تحقیقِ مفردات میں مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اُصول یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے وہی معنی لینے چاہئیں جو معروف اور ثابت ہوں۔ شاد معنیٰ ہر گز نہ لیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"اللفظ إذا استعمل، لا بدّ أن يدل على مفهومه المعلوم الثّابت، فإن أريد به مفهوم يُنكره النّاس ويدّعيه مدّع ولا سبيل إلى إثباته، فهذا تعمية، والقرآن أنزله الله عربيًّا مبينًا، فلأيّ شيء يُترك الإفصاح."[1]

"لفظ کا معروف ومستند اور قطعی معنی مراد لیا جائے، کیونکہ اگر غیر معروف، شاذ اور بے بنیاد معنیٰ مراد لیا گیا تو یہ کلام میں ابہام وتعقید پیدا کرنے کے مترادف ہو گا۔ قرآن کریم تو شستہ وشگفتہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے، پھر آخر یہ شگفتگی اور فصاحت کس بنیاد پر نظر انداز کر دی جائے؟

فاتحہ نظام القرآن میں تفسیر کے لسانی ماخذ پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"كذلك يجب أن نترك المعنى الشاذّ من اللّغة كما قيل في معني التمنّي أنه هو التلاوة، وما فزعوا إلى هذا المعنى الشاذّ الذي لم يثبت إلا فرارًا من بعض الإشكال، وهذا فتح لأبواب الفتنة واختلاف الأمّة، فمن ترك جادة الطّريقة وأذلالها لَعِبت به الأوهام والأهواء."[2]

"ضروری ہے کہ لغت میں سے شاذ معنیٰ کو ترک کر دیا جائے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے ﴿ تَمَنّٰی ﴾[3] کے معنیٰ تلاوت کرنے کے لیے ہیں۔ اس طرح کے غیر ثابت اور شاذ معنی کی طرف جو لوگ گئے ہیں محض بعض اشکالات سے بچنے کیلئے گئے ہیں، حالانکہ یہ بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے، اور اس سے امت میں اختلاف کا دروازہ کھلتا ہے، جو شخص اصل شاہراہ کو چھوڑ کر چلے گا تو وہ مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھائے گا۔"

---

[1] الفراهي، حميد الدين، أبو أحمد، التكميل في أصول التأويل: ص53، الدائرة الحميدية، مدرسة الإصلاح، سرائي مير اعظم كرهـ، الطبعة الأولى، 1388هـ

[2] تفسير نظام القرآن: ص32

[3] ﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ ﴾. سورة الحجّ، 22 : 52

اس اہم اور بنیادی اصل کو سامنے نہ رکھنے کی وجہ سے مولانا فراہی کے مطابق ہمارے علمائے تفسیر نے بعض الفاظ کے وہ معنی بیان کر دیئے ہیں جو نہ صرف حقائق کے خلاف ہیں بلکہ وہ ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں اور طبیعت بھی انہیں تسلیم کرنے سے ابا کرتی ہے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی پہلی مثال یہ بیان کی ہے کہ آیتِ کریمہ: ﴿ إِنْ تَتُوبَآ إِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ﴾[1] کا ترجمہ عام طور پر مفسرین نے یہ کیا ہے کہ اگر تم دونوں اللہ سے توبہ کرتی ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کیونکہ تمہارے دل سیدھی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ مفسرین نے یہاں لفظ "صغو" کے مفہوم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور اس لفظ کو ایک ایسا معنی پہنا دیا ہے جس کی کلامِ عرب میں کوئی نظیر نہیں۔ گویا معروف کو چھوڑ کر غیر معروف کا سہارا لیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"الميل معنى كلّي. ثم تحته: الزّيغ والجور والارعواء والحيادة والتّنحي والانحراف كلها للميل عن الشيء ؛ والفيء والتّوبة والالتفات والصّغو كلّها للميل إلى الشّيء، فمن خبط بينهما ضلّ وأضلّ. فلا يخفى على العالم بلسان العرب أنّ قوله تعالى: ﴿ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ﴾ معناه أنابت قلوبكما، ومالت إلى الله ورسوله. فإن الصّغو هو الميل إلى الشّيء، لا عن الشّيء."[2]

" میل (جھکنا، ہٹنا) ایک کلّی مفہوم ہے۔ اس کے تحت عربی میں بہت سے الفاظ ہیں۔ مثلاً الزّیغ، الجور، الارعواء، الحیادۃ، التّنحي اور الانحراف وغیرہ، لیکن یہ سب المیل عن الشّيء یعنی کسی چیز سے ہٹنے اور پھرنے کے لئے آتے ہیں۔ پھر اس کے تحت الفيء، التّوبة، الالتفات اور الصّغو وغیرہ الفاظ ہیں، جو سب کے سب المیل إلى الشّيء یعنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کے باریک فرقوں سے ناواقف ہیں وہ زبان کو سمجھنے میں خود بھی غلطیاں کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلطیوں میں ڈالتے ہیں۔ اس نکتہ کے واضح ہو جانے کے بعد عربی زبان کے ایک عالم سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ ﴿ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا ﴾ کے معنی ہیں: "أنابت قلوبكما ومالت إلى الله ورسوله" "تم دونوں کے دل اللہ اور اس کے رسول کی طرف جھک چکے ہیں۔ کیونکہ "صغو" کا لفظ کسی شے کی طرف جھکنے کیلئے آتا ہے، کسی شے سے مڑنے اور ہٹنے کیلئے نہیں آتا۔"

مولانا کے نزدیک اس آیت کا اسلوب بھی اس مفہوم کی نفی کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اہل عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ کلام میں حشو و زوائد سے بہت بچتے ہیں اور بات کے جتنے حصہ کا حذف ممکن ہو اس کے ذکر کو بلاغت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ فنِ بلاغت کا ایک نہایت وسیع باب ہے

---

[1] سورة التحريم: 66 : 4

[2] تفسير نظام القرآن: ص198

جس کی تفصیلات طویل ہیں۔ ہم یہاں صرف اتنے حصہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں جتنا "إِنْ" شرطیہ اور "قَدْ" سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے ہم بعض مثالیں نقل کریں گے تاکہ جس محذوف کو ہم روشنی میں لانا چاہتے ہیں، اس کی طرف اشارہ کر سکیں۔ قرآنِ مجید میں ہے: ﴿ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ ﴾[1] کہ اگر تم فتح چاہتے تھے تو لو فتح آگئی۔ دوسری جگہ ہے: ﴿ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ﴾[2] کہ اگر یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو کچھ تعجب نہیں تم سے پہلے دوسرے انبیاء کو بھی جھٹلایا گیا۔ ایک جگہ ہے: ﴿ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾[3] کہ اگر یہ اس کا انکار کرتے ہیں تو کچھ غم نہیں، ہم نے اس پر ایک ایسی قوم مامور کی ہے جو اس کی منکر نہیں ہے۔

ان تمام مثالوں پر غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کے اسالیب میں 'قَدْ' کے بعد جو جملہ ہوا کرتا ہے وہ اس امر کی آسانی اور سہولت کو بیان کرتا ہے جو "إِنْ" کے بعد کہی جاتی ہے، یعنی اسلوبِ محذوف کو اگر کھول دیا جائے تو تقدیرِ کلام یہ ہوتی ہے کہ اگر ایسا ایسا ہوا تو کچھ حرج نہیں، یا کوئی اشکال نہیں، یا یہ معمول کی بات ہے کیونکہ ایسا ایسا ہو چکا ہے۔ پس اس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ اگر تم پیغمبر ﷺ کی رضاجوئی کے لئے خدا سے توبہ کرو، جس طرح پیغمبر تمہاری دلداری فرماتا ہے، تو یہی بات تم سے متوقع ہے کیونکہ تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہی ہیں۔"[4]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے شاذ و منکر الفاظ استعمال کرنے کی دوسری مثال یہ دی ہے کہ آیتِ کریمہ: ﴿ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ ﴾[5] کہ اللہ نے مؤمنوں پر احسان فرمایا جب ان کے اندر انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا، کے تحت کسی کا قول یہ ہے کہ ﴿ اَنْفُسِهِمْ ﴾ میں فاء منصوب ہے یعنی مِنْ أَنْفَسِهِمْ۔ یہ تاویل بالکل باطل ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً:

① یہ معنیٰ شاذ ہیں، خود قرآن میں یہ بات موجود ہے کہ نبی ﷺ اپنی قوم میں سے تھے۔

② یہ بالکل واضح معاملہ ہے۔

③ یہ کہ رسول کا اپنی قوم میں سے ہونا کوئی عیب نہیں، وہ انہی میں سے ہوتا ہے۔

---

[1] سورة الأنفال: 8 : 19

[2] سورة آل عمران: 3 : 184

[3] سورة الأنعام: 6 : 89

[4] تفسیر نظام القرآن: ص200

[5] سورة آل عمران: 3 : 164

④ یہ کہ کلامِ عرب کے نظائر اس تاویل کے خلاف ہیں۔ عرب اس مفہوم کیلئے مِنْ خِيَارِهِمْ اور من علیائِهم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، مِنْ أَنْفُسِهِمْ نہیں کہتے۔

⑤ یہ کہ خدا کا احسان اسی شکل میں زیادہ ہوتا ہے جب رسول اپنی قوم ہی میں سے مبعوث ہو۔

⑥ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا یہی تھی کہ اللہ تعالیٰ اسی قوم کے ایک فرد کو نبوت پر سرفراز کرے۔

جن لوگوں نے یہ غلط تاویل اختیار کی وہ دراصل اسے آیتِ مباہلہ کی ایک غلط تاویل کیلئے بطور سند استعمال کرنا چاہتے تھے۔[1]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ مختلف جہتیں اور متعدد معانی پائے جانے کی شکل میں اس معنی کو ترجیح دیتے ہیں جو سیاق و سباق اور کلام کے عمود سے زیادہ مناسبت رکھتا ہو، فرماتے ہیں:

"اعلم أن ما من كلمة إلا لها أطرف وجهات فهي كالمعاني لها. وكذلك كل أمر وقصة لها اعتبارات شتى وكما أن اللفظ المشترك يأول حسب محلّه فكذلك لا بدّ أن نأول الألفاظ والأمور حسب محلّها."[2]

"معلوم ہونا چاہئے کہ ہر لفظ کی متعدّد جہتیں ہوتی ہیں جو اس کے مختلف معانی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لیے جس طرح مشترک لفظ کا معنیٰ موقع و محل کی مناسبت سے متعین کیا جاتا ہے بالکل اسی طرح دیگر الفاظ و کلمات کی تعیین بھی موقع و محل کے تناظر میں ہونی چاہئے۔"

مثال کے طور پر خدا کی مخصوص صفت اس کی کامل احدیت ہے لیکن اس کے باوجود ہم مختلف مواقع پر اللہ تعالیٰ کا ذکر مختلف اسماء کے ساتھ اور الگ الگ ترتیبوں سے پاتے ہیں، جیسے: ﴿بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِكِ النَّاسِ ۝ إِلٰهِ النَّاسِ ۝﴾[3] یا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾[4] یا ﴿الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝﴾[5] یا ﴿وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۝﴾[6] یا ﴿اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ﴾[7] جو شخص قرآن کو غور سے پڑھنے کا عادی نہیں وہ نہ کلمات کے موقع و محل کی طرف توجہ کرتا ہے اور

---

[1] التكميل: ص64

[2] أيضًا: ص57

[3] سورة الناس: 114 : 1 ـ 3

[4] سورة الفاتحة: 1 : 2 ـ 4

[5] سورة الجمعة: 62 : 1

[6] سورة الملك: 67 : 2

[7] سورة الحشر: 59 : 23

اور نہ ان کے خاص پہلوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ایک صاحبِ نظر اور حقیقت کے متلاشی پر جب ایک مرتبہ بعض ظاہر پہلو واضح ہو جائیں تو اس کیلئے مزید غور و فکر کو ترک کرنا آسان نہیں رہ جاتا۔ وہ آگے کی حقیقتوں سے واقف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

اس اصول کا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر لفظ غیر مشترک ہو تو اس کو ایک ہی معنی کیلئے محدود کرنا لازم نہیں آتا، جیسا کہ بعض اہل الرائے کا خیال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ مجاز بھی ہو سکتا ہے حقیقت بھی۔ وہ اپنے عمومی معنی میں بھی ہو سکتا ہے خصوصی معنی میں بھی۔ اس کے معنی کے پہلو بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔ البتہ اس کا استعمال موقع و محل کے تقاضا کے تحت ہوتا ہے۔[1]

کلام میں اگر متعدد احتمالات ہوں تو اس احتمال کو ترجیح ہوگی جس کی نظیر قرآنِ مجید میں موجود ہو۔ اور جس کی نظیر قرآن مجید میں موجود نہ ہو اسے ترک کر دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر دو معانی کا احتمال ہو اور دونوں کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہوں تو اسی احتمال کو ترجیح حاصل ہوگی جو نظمِ کلام کے مطابق ہو۔ مولانا فرماتے ہیں:

"إذا كان الكلام ذا احتمالات، تؤخذ منها ما كان لها نظير في باقي القرآن. فما لم يوافقه قرآن غير فيه النزاع يترك."[2]

مثلاً آیتِ کریمہ: ﴿ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝۲۴ ﴾[3] کی درج ذیل تاویلیں ہو سکتی ہیں: 1. اللہ جَلَّ جَلَالُہٗ تمہارے ضمیر سے خود تم سے زیادہ واقف ہے۔ 2. اللہ عَزَّوَجَلَّ آدمی کو اس کے ارادہ سے روک دیتا ہے۔

پہلی تاویل کی نظیر بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور نظمِ کلام بھی اس کی تائید کرتا ہے، کیونکہ ﴿علم﴾ کا تصور دل میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ اسی لیے متعدد مقامات پر اس کا ذکر تقوی کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّكُمْ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝۲۰۳﴾[4]، ﴿ وَ اَنْ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّقُوْهُ١ؕ وَ هُوَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝۷۲﴾[5]، ﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ۝۹﴾[6] اور تقویٰ پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے تصورِ علم سے۔ تو گویا یہاں بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو کیونکہ وہ تمہارے رازہائے سربستہ سے واقف

---

[1] التكميل: ص57، 58

[2] أيضًا: ص58

[3] سورة الأنفال: 8 : 24

[4] سورة البقرة: 2 : 203

[5] سورة الأنعام: 6 : 72

[6] سورة المائدة: 5 : 96؛ سورة المجادلة، 58 : 9

ہے اور تمہیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ یہ ایک جہت ہوئی یا یوں کہئے کہ اس کا ایک مفہوم یہ ہوا جس کی نظیر بھی قرآن مجید میں موجود ہے اور یہ نظم کلام سے ہم آہنگ بھی ہے۔

رہی دوسری تاویل تو نظیر اس کی بھی قرآن مجید میں موجود ہے، چنانچہ ارشاد ہوا: ﴿ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ ﴾[1] لیکن سیاق کلام اس کی تائید نہیں کرتا۔[2]

اگر معنیٰ کسی ایسی عبارت کا مقتضی ہو جو کلام میں مذکور نہیں تو یہ مرجوح ہوگا۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

"إذا كان المعنى مقتضيًا لعبارة غير ما في الكلام، فذلك المعنى مرجوح."[3]

مثلاً تغنّی بالقرآن کے مفہوم کے تعین میں سیدہ عائشہؓ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی اصول سے استدلال کیا۔ اس بارے میں سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ (198ھ) کا خیال تھا کہ اس کا مطلب يستغني بالقرآن ہے۔ جب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ (204ھ) سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس صورت میں حدیث کے الفاظ یوں ہونے چاہئیں تھے: "من لم يستغن بالقرآن" چونکہ "لم يَتَغَنَّ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لئے حدیث کا مفہوم استغناء نہیں بلکہ تغنی ہے۔[4]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تاویل کے ترجیحی اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ مختلف شکلوں میں سے سب سے زیادہ پائیدار اور ثابت شدہ شکل کو اختیار کیا جائے، چنانچہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

"فإن المعنى الذي كثر في كلام العرب لا ينبغي تركه إلا لصارف قوي، فإذا تساوى الوجوه الأخر وهو النّظم والموافقة بباقي القرآن وصريح العقائد، لا بدّ أن نأخذ المعنى الشّائع."[5]

"جو معنیٰ کلامِ عرب میں کثرت سے مستعمل ہو، اسے اس وقت تک ترک نہ کیا جائے، جب تک کہ کوئی زبردست مانع نہ پایا جائے۔ چنانچہ جب دیگر وجوہ مثلاً سورہ کا ربط و نظام، آیات کا سیاق، صریح عقائد اور دیگر آیات قرآنی سے ہم آہنگی اور مطابقت وغیرہ یکساں طور پر پائی جائیں تو ایسے وقت میں لازمی طور پر معروف و مشہور معنیٰ ہی اختیار کرنا چاہئے۔"

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی مثال ﴿ لِلذَّكَرِ ﴾ کی پیش ہے۔ کلامِ عرب میں اس کے معروف معنیٰ پنڈلی کا

---

[1] سورة سبأ: 34 : 54

[2] التكميل: ص59

[3] أيضًا: ص59

[4] أيضًا: ص30، 59

[5] أيضًا: ص62

گوشت ہیں۔ شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1814ھ) نے آیت کریمہ ﴿ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ ﴾[1] کے ترجمہ میں اس سے مراد کلیجہ لیا ہے حالانکہ اگر سیاقِ کلام کو مد نظر رکھا جائے تو موقع منکرین کے دوزخ میں داخل ہونے کا نہیں بلکہ عذاب کے قرب کے تذکرہ کا ہے ... جن لوگوں نے ﴿لِّلشَّوٰى﴾ کو سر کی کھال کے معنی میں لیا ہے انہوں نے بھی غلطی کی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ بہت کم آیا ہے وہاں بھی اس کے معروف معنیٰ ہی کا احتمال موجود ہے۔ پھر قرآن و حدیث میں آگ کی اس کیفیت کا ذکر نہیں آیا کہ وہ بالکل اوپر سے سر کی کھال اڑا لے جائے گی۔ بالفرض اگر یہ دونوں معنی برابر قرار دیے جائیں، تب بھی ان میں سے وہی اختیار کیا جائے گا جو نظم سے زیادہ موافقت رکھتا ہو اور باقی قرآن سے بھی اس کے دلائل ملتے ہوں۔[2]

حروف مقطعات

حروفِ مقطعات سے متعلق علمائے کرام کی مختلف آراء سامنے آئی ہیں۔ تاہم اس سلسلہ میں مولانا فراہیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عربی زبان کے حروف عبرانی سے لیے گئے ہیں اور عبرانی کے یہ حروف ان حروف سے ماخوذ ہیں جو عرب قدیم میں رائج تھے۔ یہ حروف آواز کے ساتھ معانی اور اشیاء پر بھی دلیل ہوتے تھے اور جن معانی یا اشیاء پر وہ دلیل ہوتے تھے عموماً انہی کی صورت اور ہیئت پر لکھے بھی جاتے تھے۔ ان حروف کے معانی کا علم اب اگرچہ مٹ چکا ہے، تاہم بعض حروف کے معنی اب بھی معلوم ہیں اور ان کے لکھنے کے ڈھنگ میں بھی ان کی قدیم شکل کی کچھ نہ کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ مثلاً 'الف' کے متعلق معلوم ہے کہ وہ گائے کے معنی بتاتا تھا اور گائے کے سر کی صورت پر ہی لکھا جاتا تھا۔ 'م' پانی کی لہر پر ہی دلیل ہوتا تھا اور اس کی شکل بھی لہر سے ملتی جلتی بنائی جاتی تھی۔ مولانا نے اپنے نظریے کی تائید میں سورۂ 'ن' کو پیش کیا ہے۔ حرف 'ن' اب بھی اپنے قدیم معنی ہی میں بولا جاتا ہے۔ اس کے معنی مچھلی کے ہیں اور اس سورت میں سیدنا یونس علیہ السلام کا ذکر صاحب الحوت (مچھلی والے) کے نام سے آیا ہے۔ مولانا اس نام کو پیش کر کے فرماتے ہیں کہ اس سے ذہن قدرتی طور پر اس طرف جاتا ہے کہ اس سورۃ کا نام 'نون' اسی وجہ سے رکھا گیا ہے کہ اس میں صاحب الحوت (یونس علیہ السلام) کا واقعہ بیان ہوا ہے جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ پھر کیا عجب کہ بعض دوسری سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں وہ اپنے قدیم معانی اور سورتوں کے مضامین کے درمیان کسی مناسبت ہی کی بناء پر آئے ہوں۔[3]

---

[1] سورة المعارج: 70 : 16

[2] التکمیل: ص63

[3] تفسیر نظام القرآن: ص98

اسالیب القرآن اور مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی علمی اور فکری کاوشوں سے مختلف علوم و فنون میں نہایت قیمتی اضافہ فرمایا ہے۔ علمِ تفسیر، علمِ لغت اور علمِ نحو و بلاغت کے سلسلے میں ان کا علمی اور فکری سرمایہ جو ہمارے سامنے موجود ہے، مختصر ہونے کے باوجود بہت ہی وقیع اور گراں قدر ہے۔ مولانا ویسے تو علومِ قدیمہ کے ساتھ ساتھ علومِ جدیدہ سے بھی بہرہ ور تھے، مگر انہوں نے انہی علوم و فنون کو اپنی تحقیق و جستجو کا مرکز و محور بنایا جن کا تعلّق قرآنی علوم سے تھا۔

'اسالیب القرآن' مولانا کی ایک مختصر سی تصنیف ہے لیکن اس میں انہوں نے بڑی اہم باتیں بیان فرمائی ہیں۔ اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو قرآن مجید کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ ذیل میں کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے واضح ہو جائے گا کہ مولانا کی رائے کس قدر ٹھوس، مدلّل، واضح اور موقع و محل کے اعتبار سے انسب ہے:

1. واؤ عاطفہ

'اسالیب القرآن' کی ایک اہم بحث 'واؤ عاطفہ' کی ہے۔ مولانا حمید الدّین فراہی کا کہنا ہے کہ 'واؤ عاطفہ' بیانیہ بھی ہوتا ہے۔ عام طور پر علماء لغت اور ائمہ نحو 'واؤ' کو بیانیہ نہیں مانتے حالانکہ کلامِ عرب اور قرآنِ مجید دونوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک حمّاسی شاعر کہتا ہے:

وَقُلْ لَهُمْ بَادِرُوا بِالْعُذْرِ وَالتَمِسُوا قولًا يُبَرِّئُكُمْ أَنِّي أَنَا المَوْتُ[1]

"ان سے کہو: جلد از جلد معذرت پیش کرو، یعنی کوئی ایسی بات تلاش کرو جو تمہیں بے گناہ ثابت کر دے۔ ورنہ میں موت ہوں، تمہاری خیریت نہیں ہے۔"

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ توبہ سے 'واؤ بیانیہ' کی ایک مثال یہ پیش کی ہے: ﴿وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝﴾[2]

بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ آیتِ کریمہ میں ایمان باللہ اور جہاد دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ مگر مولانا کہتے ہیں کہ ﴿وَجَاهِدُوْا﴾، ﴿اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ﴾ کی تفسیر ہے۔ اسی طرح ﴿وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ﴾، ﴿اسْتَاْذَنَكَ﴾ کی توضیح ہے۔[3]

---

[1] الأصفهاني، أبو علي أحمد بن محمد، شرح ديوان الحماسة: 1/ 125، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 2003م

[2] سورة التّوبة: 9 : 86

[3] الفراهي، حميد الدين، أبو أحمد، أساليب القرآن: ص48، الدائرة الحميدية، مدرسة الإصلاح، سرائي ميز أعظم كرهـ، الطبعة الأولى، 1389هـ

اس اہم اسلوب کی وضاحت اسی سورت کی ایک اور آیت سے ہوتی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ﴾[1] اس آیتِ کریمہ میں ﴿ مِنَ الْكُفَّارِ ﴾ کی تاویل میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں: 1. اس سے مراد رومی ہیں۔ 2. اس سے مراد فریضہ، نضیر اور خیبر کے یہود ہیں۔ 3. دیلم مراد ہیں۔ 4. عرب کے مشرکین ہیں۔ 5. اس میں کوئی گروہ مراد نہیں ہے بلکہ اقرب فالاقرب کے اصول پر تمام ہی مشرکین سے جنگ کی جائے گی۔[2]

اس آیت کریمہ کی تاویل اگر مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول کی روشنی میں کی جائے تو مراد واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں ﴿ مِنَ الْكُفَّارِ ﴾، ﴿ الَّذِينَ ﴾ کا بیان ہے اور اس سے مراد منافقین ہیں۔ ﴿ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ﴾، ﴿ قَاتِلُوا ﴾ کی وضاحت ہے۔ ﴿ يَلُونَكُمْ ﴾ کا لفظ معاشرتی اعتبار سے مسلمانوں اور منافقین کے قریبی تعلّق کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق آیتِ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ یہاں مخلص اہل ایمان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم سب سے زیادہ منافقین سے چوکنے رہو، ان کا معاشرتی بائیکاٹ کرو، ان کے ساتھ نرمی، ہمدردی اور ملاطفت کا رویہ نہ اپناؤ، کیونکہ یہ آستین کے سانپ ہیں۔ یہ رہتے تو ہیں تم سب سے بہت قریب، لیکن ہمیشہ تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے کسی مناسب وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ آیت کی یہ تاویل اس سورہ کے تفصیلی مضمون، سیاق وسباق اور نظم کلام سے بھی واضح طور پر مربوط اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔[3]

2. حذف

اسالیب القرآن کے اُصولوں میں سے ایک اہم اصول حذف بھی ہے۔ عام طور پر مفسرین اور نحوی حضرات حذف کے قائل تو ہیں، لیکن بعض مواقع کو چھوڑ کر حذف کو کلام کی ایک خامی تصور کرتے ہیں۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حذف کا قاعدہ دُنیا کی تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے، البتہ عرب اپنی فطری ذہانت وطباعی کی وجہ سے حذف کے معاملے میں تمام دُنیا سے ممتاز اور نمایاں ہیں۔ وہ کلام کے ان اجزاء کو جنہیں مخاطب بادنیٰ تامّل سمجھ جائے، بے تکلّف حذف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کلام کا اعلیٰ معیار یہی ہے کہ وہ حشو وزوائد سے پاک ہو۔ مولانا نے اس سلسلے میں کلامِ عرب اور قرآنِ مجید سے بہت سے شواہد پیش کیے ہیں، جو مولانا کی اصولِ تفسیر پر لکھی کتابوں مثلاً "التكميل في أصول التأويل" میں اجمالًا اور "أساليب القرآن" اور "جمهرة البلاغة" میں تفصیلًا موجود ہیں۔ مولانا کے خیالات کی ایک جھلک واضح کرنے کیلئے ذیل میں چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں۔ مولانا

---

[1] سورة التّوبة: 9 : 123

[2] جامع البيان: 14 / 575، 576

[3] فراہی، حمید الدین، علامہ، حیات وافکار: ص391، مرتب عبید اللہ فراہی، انجمن مدرسۃ الاصلاح، اعظم گڑھ، 1992ء

فراہی رحمۃ اللہ علیہ اپنی بلند پایہ کتاب 'جمہرۃ البلاغۃ' میں اصولِ حذف پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ومن الحذف الذي يتّصل بالنحو ولم يهتد إليه النحويّون فمنه الحذف من المعطوف بعض ما في المعطوف عليه وبالعكس."[1]

"حذف کی بعض مثالیں وہ ہیں جن کا تعلق علم نحو سے ہے لیکن عموماً نحویوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکی، جیسے معطوف سے اس جزء کو حذف کر دینا جو معطوف علیہ میں ہو اور اس کے برعکس بھی۔"

مثلاً آیتِ کریمہ: ﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ﴾[2] میں مذکورہ اسلوب استعمال کیا گیا ہے۔ اسے کھول دیجئے تو عبارت یوں بنے گی: ﴿وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ مِنْ خِيفَتِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ تُحَمِّدُهُ مِنْ خِيفَتِهٖ﴾ اسی طرح آیت کریمہ: ﴿قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ﴾[3] میں حذف کھولیے تو گویا پوری عبارت یوں بنے گی: «قِيلَ يٰنُوحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِنَّا عَلَيْكَ وَبَرَكٰتٍ مِنَّا عَلَيْكَ»

ان دونوں آیتوں میں حذف کی مثالیں بالکل واضح ہیں لیکن مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کسی نے بھی اس کی نشاندہی نہیں کی ہے۔ حالانکہ مولانا کے بقول یہ حذف کی مثالیں بالکل اسی طرح ہیں جس طرح ذَهَبَ زَيْدٌ وَعَمْرٌو میں 'زید' کے بعد ذَهَبَ فعل اور صَلَّى زَيْدٌ وَصَامَ میں صَامَ کا فاعل 'زید' حذف ہو گیا ہے۔[4]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے حذف کے اُصول اور مواقع کو سب سے زیادہ اپنی کتاب 'اسالیب القرآن' میں بیان فرمایا ہے اور تقریباً پندرہ اصول پیش کر کے اس اسلوب پر مفصّل روشنی ڈالی ہے۔ ان میں سے ایک مثال مولانا کے مؤقف کو واضح کرنے کیلئے حسبِ ذیل ہے، فرماتے ہیں:

"منها حذف جانبين من المتقابلين لما دلّ عليه مقابله، كما قال تعالى: ﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ أي: أَذَاقَهَا الله طَعْمَ الْجُوعِ وَأَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ."[5]

یہاں دونوں مقابل کے ایک ایک پہلو کو ایک دوسرے کی دلیل کے تحت حذف کر دیا گیا ہے۔ عام طور پر مفسرین نے اس آیت کریمہ میں اس اسلوب کو استعارہ یا تشبیہ قرار دیا ہے۔[6] جبکہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ اسے

---

[1] الفراهي، أبو أحمد عبد الحميد، جمهرة البلاغة: ص68، الدائرة الحميدية، مدرسة الإصلاح، سرائي مير اعظم كرهـ

[2] سورة الرّعد: 13 : 13

[3] سورة هود: 11 : 48

[4] جمهرة البلاغة: ص68

[5] أساليب القرآن: ص29

[6] الزمخشري، أبو القاسم محمود بن عمرو، لكشّاف: 2/ 346، دار الكتب العربي، بيروت، الطبعة الثالثة، 1407هـ

تشبیہ یا استعارہ نہیں بلکہ حذف کی ایک انتہائی اعلیٰ مثال قرار دیتے ہیں۔

اسی طرح اس کی ایک مثال سورۂ طٰہٰ میں آیتِ کریمہ: ﴿قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ۙ۝ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝﴾[1] ہے، عام مفسرین نے یہاں 'لا' کو زائد قرار دیا ہے۔[2] جبکہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں بھی حذف ہے، اسے کھولیں تو عبارت یہ بنتی ہے: قَالَ يٰهٰرُونُ مَا مَنَعَكَ إِذْ رَأَيْتَهُمْ ضَلُّوا * أَن تَتَّبِعَنِ وَأَمْرُكَ أَلَّا تَتَّبِعَنِ أَفَعَصَيْتَ أَمْرِي.[3]

3. نفی

قرآنِ کریم کا ایک اہم اسلوب نفی بھی ہے۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اسلوب کی کچھ مثالیں پیش کی ہیں۔ جن سے ایک نفي الشّيء بلازمه کی مثال بھی ہے۔[4] اس اسلوب کی تائید میں مولانا نے کلامِ عرب سے امرؤ امرؤالقیس کے ایک شعر کا یہ مصرعہ نقل کیا ہے:

"عَلَىٰ لَاحِبٍ لَا يُهْتَدَىٰ بِمَنَارِهِ"[5]

"اس راستے پر آہ وفغاں نہ کر جس کے میناروں کی روشنی سے رہنمائی نہیں حاصل کی جاسکتی۔"

مطلب یہ کہ یہاں کسی منارۂ نور کا وجود ہی نہیں ہے کہ اس سے روشنی حاصل کرنے کا سوال پیدا ہو۔ یہی اسلوب قرآن کریم اس آیتِ کریمہ میں بھی ہے: ﴿قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾[6] اس آیتِ کریمہ میں ﴿لَا يَعْلَمُ﴾ کا مفہوم یہ ہے کہ اس شے کا وجود ہی نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا وجود ہوتا تو اللہ جل جلالہ کو ضرور اس کا علم ہوتا۔[7]

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا پیش کردہ اُصول گو نادر نہیں ہے کیونکہ عموماً مفسرین نے ان آیات کا مفہوم وہی بیان کیا

---

1. سورة طه: 20 : 92
2. الثعلبي، أحمد بن محمد بن إبراهيم، الكشف والبيان عن تفسير القرآن: 6/ 258 ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 2002م
3. حیات وافکار: ص395
4. أساليب القرآن: ص43
5. درويش، محي الدين بن أحمد، إعراب القرآن وبيانه: 1/ 426، دار اليمامة، دمشق، بيروت، الطبعة الرابعة، 1415ھ۔ مکمل شعر اس طرح ہے: عَلَىٰ لَاحِبٍ لَا يُهْتَدَىٰ بِمَنَارِهِ * إِذَا سَافَهُ الْعَوْدُ الدِّيَافِي جَرْجَرَا (ديوان امرئ القيس: 1 / 20 ؛ معجم مقاييس اللغة: 2 / 261)
6. سورة يونس: 10 : 18
7. أساليب القرآن: ص43

ہے جو مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا ہے۔ البتہ مولانا اسے کلامِ عرب اور قرآنِ مجید کے معروف اسلوب کے طور پر پیش کرتے ہیں، جبکہ دوسرے مفسرین اسے کہیں کہیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مثلاً سورۂ آل عمران کی آیتِ کریمہ: ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ﴾[1] میں ﴿ لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ﴾ کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال درج ذیل ہیں:

1. سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ: ان کی توبہ اس لیے نہیں قبول کی جائے گی کہ انہوں نے ارتداد کی روش اختیار کی اور لوگوں کو صرف دکھانے کے لیے توبہ کا اظہار کیا، حالانکہ کفر ان کے دلوں میں راسخ ہو چکا تھا۔

2. ابو العالیۃ: چونکہ انہوں نے شرک کی آلائشوں میں رہتے ہوئے توبہ کی، اس لیے ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔

3. حسن بصری، قتادہ، عطاء الخراسانی اور سدی کا خیال ہے کہ جو لوگ موت کے فرشتے دیکھنے کے بعد توبہ کریں گے، ان کی توبہ قبول نہیں ہو گی۔

4. مجاہد: موت کے بعد ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، کیونکہ انہوں نے حالتِ کفر میں جان دی ہے۔[2]

جیسا کہ مفسرین کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام کے تمام اس پر متفق ہیں کہ وہ لوگ توبہ کریں گے البتہ مختلف وجوہات کی بنیاد پر بارگاہ خداوندی میں، ان کی توبہ شرف قبولیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے نفی کا جو اسلوب کلامِ عرب اور قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کیا ہے، اس کو اگر سامنے رکھا جائے تو مذکورہ آیت کا یہ ٹکڑا بھی " نفي الشّيء بلازمه " کی مثال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ چونکہ وہ کفر و انکار اور بغاوت و سرکشی کی حدوں سے تجاوز کر چکے ہیں اور اس میں آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں، اب ان میں حق و انصاف اور ایمان و اسلام کی ذرہ برابر بھی رمق نہیں ہے، اس لیے یہ ہرگز توبہ کر کے اپنی زندگی سدھار ہی نہیں سکتے۔ گویا ﴿ لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ﴾ کا مفہوم یہ ہو گا کہ وہ ہرگز توبہ نہیں کریں گے کہ ان کی توبہ قبول کرنے کا سوال پیدا ہو۔[3]

4. تقدیم و تاخیر

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ قرآنی اسلوب کے اس پہلو پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فاعلم أن التّرتيب يكون على أنحاء شتى، والشيء يقدّم ويؤخّر لوجوه، وليس أن المقدّم أفضل

---

[1] سورة آل عمران: 3 : 90

[2] ابن أبي حاتم، أبو محمد عبد الرحمن بن محمد، تفسير القرآن العظيم لابن أبي حاتم: 2/ 702 ، مكتبة نزار مصطفى الباز، المملكة العربية السعودية، الطبعة الثالثة، 1419هـ

[3] حیات وافکار: ص398

في كل موضع، كما قال تعالى: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ وترى المفسّرين كثيرًا أنهم يقولون: هذا تقديم ما حقّه التأخير. وإني لا أحبّ هذا القول، وكل موضع ذهبوا فيه إلى هذا القول لم أجد أمرًا خلاف ما حقّه."[1]

"یہ بات جان لو کہ ترتیبِ کلام کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ عبارت میں کسی جزء کا مقدم یا مؤخر ہونا مختلف وجوہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ جو چیز مقدم ہو لازماً وہ ہر جگہ سب سے افضل ہی ہو۔ جیسا کہ آیتِ کریمہ میں ہے: ﴿فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَ مِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَ مِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ کہ ان میں سے کچھ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ میانہ رو ہیں اور کچھ اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ لیکن تم اکثر مفسرین کو دیکھتے ہو وہ کہتے ہیں کہ عبارت میں اس کو مؤخر ہونا چاہئے تھا لیکن مقدم ہو گیا۔ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے، جہاں بھی انہوں نے اس طرح کا خیال ظاہر کیا ہے وہاں کسی امر کو میں نے اس کے برخلاف نہیں پایا جہاں اسے ہونا چاہئے۔"

دیگر ائمہ تفسیر بھی تقدیم وتاخیر کے قائل ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہیں کہ یہ مقدم تو ہو گیا ہے لیکن اسے مؤخر ہونا چاہئے تھا۔ ان کے نزدیک تقدیم وتاخیر گویا ایک طرح کا عیب ہے جسے دور کرنے کیلئے یہ اصطلاح وضع کی گئی ہے۔

لیکن مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ بڑی بلند آہنگی سے کہتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں جو مقدم ہے، اس کا مقدم ہونا حق ہے اور جو مؤخر ہے اسے مؤخر ہونا چاہئے۔ اگر مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کر دیا جائے تو کلام کی تاثیر اور زورِ بیان، عبارت کی رعنائی ودل کشی اور جملہ کا حسن وجمال غارت ہو کر رہ جائے گا۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس نقطۂ نظر کو ''جمہرۃ البلاغۃ'' میں تفصیل سے واضح کیا ہے۔ "دلالۃ الوصل" کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں:

"ومن هذا الباب ما يراد فيه الاتّصال والفصل لأجل التّصوير للواقعة، ومثاله في قصّة نوح فإن دعاء نوح في ابنه وردّه من الله تعالى واستغفار نوح والاستجابة كل ذلك جاء متأخّرا بعد تمام الواقعة، ولا شكّ أن سؤال نوح في ابنه كان قبل غرقه وقبل استواء الفلك على الجوديّ فلو وضع هذه الأمور في محلّها الزّماني لتباعدت أجزاء التّصوير ولم يتّضح."[2]

"اسی باب میں وہ اسلوب بھی داخل ہے جس میں اتصال اور انفصال کو پورے واقعہ کی تصویر کشی کیلئے لایا جاتا ہے، اس کی مثال سیدنا نوح علیہ السلام کا قصہ ہے، کیونکہ نوح علیہ السلام کا بیٹے کیلئے دعا کرنا اور اس کا رد ہونا اور پھر

[1] أساليب القرآن: ص49

[2] جمهرة البلاغة: ص64

ان کا اللہ سے نہایت عاجزی کے ساتھ طالبِ عفو ہونا اور اللہ کی طرف سے دُعا کا قبول ہونا، یہ ساری باتیں واقعہ کی تکمیل کے بعد کی ہیں۔ حالانکہ اس میں شک نہیں کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی دُعا بیٹے کی غرقابی اور جودیؔ پہاڑ پر کشتی کے ٹکنے سے پہلے کی ہے۔ لیکن اگر واقعہ کی تفصیل میں ترتیبِ زمانی کا لحاظ کیا جاتا اور تقدیم و تاخیر سے کام نہ لیا جاتا تو تصویر کے اجزاء بکھر جاتے اور واقعہ کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے نہیں آسکتا تھا۔"

مزید فرماتے ہیں:

"ثم انظر كيف أدمج القصّة في خمس آيات وجعل الخمس الباقية لدُعاء نوح والبركة فجمع القصّة في آيات عشر وجعلها صورتين كاملتين أحدهما بجنب الثانية، فهذا هو الوجه الصّحيح للتّقديم والتأخير، ثم من أحسن البيان فيه أن هلاك ابنه صور بغتة وفي أسرع حالة ومع ذلك هو أبين تصويرًا."[1]

"اس واقعہ پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے صرف پانچ آیات میں پورے واقعہ کو سمیٹ دیا ہے۔ بقیہ پانچ آیات میں سیدنا نوح علیہ السلام کی دُعا اور اس کی برکتوں کا تذکرہ ہے۔ اس طرح دس آیات میں پورا واقعہ دو کامل ترین مناظر کے ساتھ ایک دوسرے کے پہلو میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہ ہے تقدیم اور تاخیر کا صحیح رُخ۔ اور حُسنِ بیان اور اعجازِ قرآن کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی لمحہ میں نہایت سُرعت کے ساتھ بیٹے کی ہلاکت کو بیان کیا گیا ہے، لیکن پھر بھی واقعہ کی تصویر نہایت مکمل اور حد درجہ واضح اور روشن ہے۔"

کلامِ عرب سے استشہاد

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری زندگی قرآنِ کریم کے مختلف پہلوؤں پر تفکر و تدبّر کرتے ہوئے گزری، ان کی زندگی کا مرکز و محور یہی الہامی کتاب تھی لہٰذا ان کی تمام تر علمی تحقیقات اور فکری کاوشیں اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ انہوں نے قرآنی علوم کو سمجھنے کے لیے کچھ اصول منضبط کیے تھے اور ان کی روشنی میں قرآنِ کریم کی تفسیر لکھنا چاہتے تھے۔ گو مولانا کو اتنی مہلتِ حیات تو نہیں ملی کہ وہ اس عظیم کام کو مکمل کرسکتے البتہ چند سورتوں کی تفسیر لکھ کر انہوں نے اس طرزِ تفسیر کا ایک نمونہ ضرور فراہم کردیا۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری اجزاء متعدّد خصوصیات کے حامل ہیں۔ لیکن ان میں دو خصوصیتیں ایسی ہیں جنہیں ان کا نشانِ امتیاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک تو ان کے اُصولِ تفسیر کے مطابق قرآنِ کریم کی تمام آیات وسور باہم مربوط و منظّم ہیں، اس حد تک کہ اگر ایک آیت یا ایک جملہ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیا جائے تو پورا انظام درہم برہم ہوجائے۔ مولانا کی تفسیر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے اسالیب، معانی ومفاہیم اور زبان وبیان کی تفہیم و تشریح کیلئے وہ کلامِ عرب کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم کا نزول سرزمین حجاز اور عربوں کی زبان میں

[1] جمهرة البلاغة: ص 64

ہوا۔ اس لئے اس کے معانی و مطالب کی تفہیم و تشریح کیلئے عربی مبین کے اسالیب سے واقفیت ضروری ہے۔ نظمِ قرآن اور کلامِ عرب سے استدلال کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ متقدّمین نے اپنی تفاسیر میں ان اُمور کی جانب توجہ مبذول کی ہے۔ لیکن نظمِ قرآن اور کلامِ عرب سے استدلال واستشہاد کو ایک مستحکم نظریہ کی صورت میں پیش کرنے کا سہرا یقیناً مولانا کے سر ہی ہے۔

اشعار سے استدلال اور استشہاد کے سلسلے میں بالعموم مولانا نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ شعراء کے نام کی صراحت کے ساتھ شعر نقل کرتے ہیں۔ کلامِ عرب سے استشہاد کے وقت وہ عموماً زیرِ بحث شعراء کے عہد کے ذکر کا خصوصی اہتمام نہیں کرتے، اگرچہ کبھی کبھی یہ اشارہ کر دیتے ہیں کہ شاعر جاہلی، مخضرمی، اسلامی یا حماسی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا اشعار سے استدلال کے سلسلہ میں عباسی شعراء سے آگے نہیں بڑھتے۔ مولانا کی زیادہ تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ جاہلی شعراء سے استشہاد کیا جائے، اس کے بعد مخضرمین اور آخری درجہ میں اموی اور عباسی عہد کے شعراء سے استشہاد کرتے ہیں۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے تمام تفسیری اجزاء میں بحیثیت مجموعی 268 اشعار سے استشہاد کیا ہے، جن میں سے 47 اشعار سے صرف سورۂ بقرہ کی تفسیر میں استدلال کیا گیا ہے، جبکہ سورۂ فاتحہ، سورۂ کافرون اور سورۂ اخلاص میں کسی شعر سے استشہاد نہیں کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم مولانا کی تفسیر سے بعض ان مقامات کا تذکرہ کرتے ہیں، جہاں مولانا نے کلامِ عرب سے استشہاد کیا ہے:

آیتِ کریمہ ﴿ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ ﴾[1] کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"اس کے متعلّق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ لفظ ہوا کے علاوہ کسی اور چیز کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔[2] اس سے اختلاف کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ صفات کا ذکر "ف" کے ساتھ ہو تو اس بات کی دلیل ہے کہ ان صفات میں ترتیب ہے اور یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب ایک ہی چیز کی صفات ہیں۔ اس لئے ان مفسرین کا مذکورہ خیال نظائرِ قرآنی اور کلامِ عرب کے خلاف ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿ وَالْعٰدِيٰتِ ضَبْحًا ۝ فَالْمُوْرِيٰتِ قَدْحًا ۝ فَالْمُغِيْرٰتِ صُبْحًا ۝ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا ۝ فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا ۝ ﴾[3]

"گواہی دیتے ہیں وہ جو ہانپتے دوڑتے ہیں، پھر ٹھوکروں سے چنگاریاں نکالتے ہیں، پھر صبح کو دھاوا کرتے ہیں پھر غبار اُڑاتے ہیں، پھر غول میں گھس جاتے ہیں۔"

---

[1] سورة الذّاريات: 51 : 2

[2] الكشف والبيان: 9 / 110

[3] سورة العاديات: 100 : 1 – 5

اس تفصیل سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ زیرِ نظر آیات میں مذکورہ صفات ایک ہی چیز سے متعلق ہیں نہ کہ علیحدہ علیحدہ، جیسا کہ ابن زیّابہ کے شعر میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

يَا لَهْفَ زَيَّابَةَ لِلْحَارِثِ الصَّـ ـابِحِ فَالغَانِمِ فَالآيِبِ[1]

''زیابہ کی طرف سے حارث پر افسوس ہے جس نے غارت گری کی، مالِ غنیمت لوٹا اور لوٹ گیا۔''[2]

آیتِ کریمہ ﴿ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ۝ ﴾[3] پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اس کا ایک مفہوم بادل بھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿ وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ ﴾[4] کہ اے زمین اپنا پانی جذب کرلے اور اے آسمان (بادل) (بادل) تھم جا۔ اس آیت میں ﴿ وَالسَّمَآءِ ﴾ سے مراد مولانا فراہی رحمہ اللہ کے نزدیک بادل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اوپر ہواؤں کی قسم کھائی گئی ہے۔ ہواؤں اور بادلوں کی مناسبت ظاہر ہے۔ قرآن کریم میں متعدّد مواقع پر دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ دوسری وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مقسم بہ کی مناسبت اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور ﴿ ذَاتِ الْحُبُكِ ﴾ کی صفت بھی اسی مفہوم کو ترجیح دینے کے حق میں ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ 'حَبَكَ' کے معنی باندھنے اور گرہ لگانے کے ہیں۔ یہیں سے یہ اس مضبوطی اور استواری کیلئے استعمال ہونے لگا جو کسی چیز کی بناوٹ میں پیدا کی جائے۔ اسی سے 'حباك' ہے جس کی جمع ''حبك'' آتی ہے۔ ''حباك'' ان دھاریوں، شکنوں اور لہروں کو کہتے ہیں جو کسی نقش اور مضبوط بناوٹ کے کپڑے میں نمایاں کی گئی ہوں۔ زہیر بن ابی سلمہ نے اپنے شعر میں اس چشمے کا نقشہ کھینچا ہے جس پر گزرنے والی ہواؤں نے اس میں لہریں پیدا کر دی ہیں:

مُكَلَّلٌ بِأُصُولِ النَّبْتِ تَنْسِجُهُ رِيحٌ خَرِيقٌ لِضَاحِي مَائِهِ حُبُكُ[5]

''نباتات کا نچلا حصہ اسکا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ جب تند و تیز ہوا اسپر گزرتی ہے تو اسکی اوپری سطح پر لہریں نمودار ہو جاتی ہیں۔''[6]

---

1 الكشاف: 1/ 41

2 تفسير نظام القرآن: ص121

3 سورة الذّاريات: 51 : 7

4 سورة هود: 11 : 44

5 الأزدي، أبو بكر محمد بن الحسن، جمهرة اللغة: 1/ 283، دار العلم للملايين، بيروت، الطبعة الأولى، 1987م

6 تفسير نظام القرآن: ص123،124

آیتِ کریمہ ﴿ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴾ [1] پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''نطق' نفس کے اندر سب سے راسخ چیز ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی فطرت کے اندر داخل اور اس کے خواص میں ہے۔ انسان کی تعریف ہی حیوانِ ناطق سے کی گئی ہے۔ اس حقیقت سے دورِ جاہلیت میں عرب بھی اچھی طرح واقف تھے۔

مرقش اکبر کا شعر اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو:

هَلْ بِالدِّيَارِ أَن تُجِيبَ صَمَمْ لَوْ أَنَّ حَيًّا نَاطِقًا كَلَّمْ [2]

''کیا کھنڈرات بہادر شخص (کی باتوں کا) جواب دینگے؟ کاش کے یہ اجڑے ہوئے محلّات بات کرتے اور گفتگو کرتے۔'' [3]

آیتِ کریمہ ﴿ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ثُمَّ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۝ ﴾ [4] میں لفظ ﴿ اَوْلٰى ﴾ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس طرح ویل کا لفظ جھڑکی اور غصہ کیلئے آتا ہے اسی طرح ﴿ اَوْلٰى ﴾ کا لفظ اظہار حسرت کے لئے آتا ہے۔ خنساء رضی اللہ عنہا (44ھ) کا شعر ہے:

هَمَمْتُ بِنَفْسِيَ كُلَّ الْهُمُومِ فَأَوْلَىٰ لِنَفْسِيَ أَوْلَىٰ لَهَا [5]

''جب پورے طور سے میں نے اپنے آپ کا جائزہ لیا تو اپنی ذات پر کفِ افسوس ملتا رہا۔'' [6]

عام مفسرین کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر لفظ "التّین" اور "الزّیتون" سے مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے دو مقام مراد لئے ہیں، اس ضمن میں مولانا نے بڑی تفصیلی بحث کی ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر کرتے ہوئے، یہاں صرف چند ضروری اُمور پر اکتفاء کیا جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ "التّین" ایک خاص مقام کا نام ہے۔ عرب اسے اسی نام سے جانتے تھے۔ عربوں کے یہاں یہ قاعدہ عام ہے کہ جو چیز جہاں کثرت سے پیدا ہوتی ہے، اسے اسی نام سے منسوب کر دیتے ہیں چونکہ یہاں انجیر کی پیداوار کثرت سے تھی اس لئے اسی سے منسوب کر دیا، مثلاً "الغضی،

---

[1] سورة الذّاريات: 51 : 23

[2] المطفي، عبد العظيم إبراهيم، خصائص التعبير القرآني وسماته البلاغية: 1/ 77، مكتبة وهبة، الطبعة الأولى، 1992م

[3] تفسير نظام القرآن: ص138- 139

[4] سورة القيامة: 75 : 34، 35

[5] المبرد، حمد بن يزيد، الكامل في اللّغة والأدب: 4 / 43 ، دار الفكر العربي، القاهرة، الطبعة الثالثة، 1997م

[6] تفسير نظام القرآن: ص216

الشّجرة اور النّخلة" وغیرہ۔ یہ لفظ کے اصل معنی سے نکل جانا نہیں ہے، بلکہ جس طرح مظروف بول کر ظرف مراد لیتے ہیں، اسی طرح لفظ کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو خاص کرتے ہیں۔

لفظ 'التّین' کو مشہور شاعر نابغہ ذبیانی (متوفیٰ 405ھ) نے اپنے اشعار میں استعمال کر کے اس سے شمال کا ایک پہاڑ مراد لیا ہے:

وَهَّبَتِ الرّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ ذِي أُرُلٍ تُزْجِي مَعَ اللَّيْلِ مِن صُرَّادِهَا صِرَمَا

صُهْبَ الظَّلَالِ أَتَيْنَ التّينَ عَنْ عُرُضٍ يُزْجِينَ غَيْمًا قليلًا مَاؤُه شَبِمَا[1]

"ہوا جبل اُرل کی جانب سے رواں ہوئی، وہ رات کے وقت ان بادل کے ٹکڑوں کو لے کر چلتی ہے، جن میں پانی نہیں ہے۔ ہوائیں سرخ رنگ کے بادلوں کو لے کر 'تین' کے بے پناہ طول و عرض سے گزرتی ہیں، ہلکے بادلوں کو ہنکائے پھرتی ہیں جن کا پانی نہایت ٹھنڈا ہے۔"

اس شعر میں نابغہ شمالی ٹھنڈی ہواؤں کا ذکر کرتا ہے جو موسم سرما کے ہلکے بادلوں کو جبل تین کے پاس ہنکائی پھرتی ہے، جن سے ٹھنڈک بڑھتی جاتی ہے، عرب شمالی ہواؤں کے چلنے کا اکثر ذکر کرتے ہیں اور کوہ جودل تو سردی اور ٹھنڈک کا خاص مرکز ہے۔[2]

لغت سے استدلال کا دائرہ کار، مولانا فراہی کے موقف کے تناظر میں

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب و سنت اور اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے روشنی نہ پڑتی ہو اور تابعین بھی اس کی تاویل میں مختلف ہوں تو پھر لغت عرب اور محاورات کی طرف رجوع ہوگا، کیونکہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس اصل سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"الشّعر ديوان العرب، فإذا خفي علينا الحرف من القرآن الذي أنزله الله بلغة العرب رجعنا إلى ديوانها فالتمسنا معرفة ذلك منه."[3]

"شعر اہل عرب کا دیوان ہے، جب ہم پر قرآنِ کریم، جسے اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں اتارا ہے، کا کوئی لفظ مخفی ہو جائے تو اس دیوان کی طرف رجوع کریں گے اور اس لفظ کا معنیٰ وہاں سے تلاش کریں گے۔"

---

[1] الزمخشري، أبو القاسم محمود بن عمرو، أساسُ البلاغة: 1/ 546، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1998م

[2] تفسير نظام القرآن: ص 344 – 346

[3] السيوطي، عبد الرحمن بن أبي بكر ، الإتقان في علوم القرآن: 2/ 67، الهيئة المصرية، العامة للكتاب، الطبعة الأولى، 1974م

لیکن لغتِ عربی سے استفادہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صرف وہی شخص اس کو بروئے کار لا سکتا ہے جو عربی زبان میں خصوصی ذوق رکھتا ہو۔ دواوین عرب اسے مستحضر ہوں اور عربی زبان کے اسالیب سے بدرجہ اتم واقفیت رکھتا ہو۔ محض لغات بینی سے کام نہیں چل سکتا، کیونکہ معاجم وقوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے، اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا اور بلا اسناد مختلف اقوال کو جمع کر دیا ہے۔ علمائے ادب جانتے ہیں کہ اشعار کی نسبت میں اختلاط واختلاف کو بے حد دخل ہے اور شاذ ونادر ہی کوئی ایسی روایت ہوتی ہے جس پر اعتماد ہو سکے۔ پھر محاوراتِ عرب کے بیان میں بھی باہم اختلاف ہے اور علمائے لغت نے تشریحات میں عمومی لغت ومحاورہ کو سامنے رکھا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ الفاظِ قرآن کی تشریح وتوضیح ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لغت قرآن ان کے سامنے ہے اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے تشریحات کی ہیں تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے، کیونکہ علمائے لغت بھی مختلف مکاتبِ فکر سے تعلّق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق محاورات کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجۂ اتم موجود ہے، لہٰذا لغت ومحاورہ سے استفادہ کیلئے چند اُمور کا پیش نظر رہنا نہایت ضروری ہے:

لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظِ مفردہ کے صرف اُن معانی کو پیشِ نظر رکھا جائے جو زمانۂ نزول کے وقت سمجھے جاتے تھے اور یہ تبھی ممکن ہے کہ عام لغت سے صرفِ نظر کر کے اولاً لغتِ قرآن وسنت کو سامنے رکھا جائے، پھر عام لغت پر نظر ڈالی جائے۔ چنانچہ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 728ھ) لکھتے ہیں:

"ويرجع في ذلك إلى لغة القرآن أو السّنة أو عموم لغة العرب."[1]

"اس کے لئے سب سے پہلے لغتِ قرآن وسنت یا عام اہلِ عرب کی لغت کی طرف رجوع کیا جائے گا۔"

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"والقرآن نزل بلغة قريش الموجودة في القرآن، فإنها تفسير بلغته المعروفة فيه إذ وُجدت لا يُعدَل عن لغته المعروفة مع وجودها وإنما يحتاج إلى غير لغته في لفظ لم يوجد له نظير في القرآن."[2]

"قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا جو قرآن میں موجود ہے۔ اس کی اسی معروف لغت کے مطابق تفسیر کرنا ضروری ہے۔ اگر کوئی لفظ اس میں موجود پایا جائے تو اس کی معروف لغت سے انحراف کرنا درست نہیں۔ دوسری لغات کی طرف تب رجوع کیا جائے گا، جب اس کی نظیر قرآن میں نہ ملتی ہو۔"

---

[1] ابن تيمية، أحمد بن عبد الحليم، مقدّمة في أصول التفسير: ص35، دار مكتبة الحياة، بيروت، الطبعة الأولى، 1980م

[2] ابن تيمية، أحمد بن عبد الحليم، مجموع الفتاوى: 15/ 88، مجمع الملك فهد لطباعة المصحف الشريف، المدينة النبوية، السعودية، الطبعة الأولى، 2003م

بایں ہمہ قواعدِ اعراب وبلاغت سے اس کے معنی ترکیبی پر غور کر لیا جائے اور سیاق وسباق پر نظر ڈالی جائے اور پھر سیاقِ کلام سے معنیٰ متعین کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس ساری تگ ودو کے بعد یہ تفسر بالرائے ہو گی، یہ معانی اجتہادی ہوں گے اور ان میں اختلاف کی گنجائش ہے، کیونکہ ایک ہی کلمہ لغتِ عرب میں متعدّد معانی کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ بعد میں آنے والوں کو متقدّمین سے کئی مواقع پر اختلاف ہوا۔ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ بعض متقدّمین کی لغت عربی سے تفسیر پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر اشارات فہم حقیقت کیلئے کافی ہیں تو "یدین" سے اعوان وانصار کو مراد لینا نہایت واضح بات ہے، کیونکہ عرب اعوان وانصار کو 'ید' کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: «وَهُمْ يَدٌ عَلَىٰ مَنْ سِوَاهُمْ» کہ وہ غیروں کے بالمقابل ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ باقی رہا اس سے علم وعمل کے ہاتھ مراد لینا، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے، تو میرے نزدیک یہ بالکل لغت کے خلاف اور محض تفسیر بالرّائے ہے۔" [1]

مندرجہ بالا طریق سے جو بھی متعین ہو اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت وسیرت کے بھی مطابق ہے؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال وافعال اور تفسیر صحابہ رضی اللہ عنہم کے منافی تو نہیں ہے، کونی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے؟

یہ تمام غور وفکر اور مساعی اس لئے ضروری ہیں کہ کتبِ لغت کثیر تعداد میں ہیں، ان سے الفاظ کا معنی جلد ہی مل سکتا ہے، وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہر حال قاصر ہیں۔ مثلاً کوئی شخص قرآن کے اصطلاحی الفاظ کی تشریح لغت سے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو یہ اس کا دماغی خلل ہو گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے تفسیر کی کوشش کی ہے، انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اس کا پہلا نمونہ ابو عبیدہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 208ھ) کی مجاز القرآن ہے۔ دار اصل علمائے بدعت نے اپنے نظریات کی ترویج کیلئے اس طریق تفسیر کو رواج دیا ہے ورنہ یہ کوئی ایسا مرجع نہیں جس کی مدد سے ہم آیت کا مفہوم متعین کر سکیں۔ ہاں صرف مفردات کی وضاحت کے سلسلہ میں کتبِ لغت کچھ نہ کچھ کام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 310ھ) رقمطراز ہیں:

"مفردات قرآن کے معانی معلوم کرنے کیلئے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے، مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کیلئے بہر حال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارۂ کار نہیں ہے۔"

ان تصریحات کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ مواردِ استعمال کا تتبع کسی حد تک مفرداتِ قرآن کے معانی حل کرنے اور سمجھنے میں تو معاون ہو سکتا ہے اور ہے، تاہم یہ ایسا ذریعہ نہیں کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفسیر میں لغت ومحاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کیلئے

[1] تفسیر نظام القرآن: ص590

شواہد تک کو چھان مارا ہے، انہوں نے بھی اپنی تفسیروں میں سنت اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم سے اعتناء کیا ہے، بلکہ ان کو مقدّم رکھا ہے اور احادیث اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم سے مدد حاصل کی ہے۔

لغوی اور شرعی معنٰی میں تعارض کی صورت میں معیار

سنّت اور لغت دونوں کی تفسیر قرآن میں واضح اہمیت موجود ہے۔ سنت کی اس لیے کہ وہ قرآن کی تبیین اور تفسیر ہے اور لغت کی اس لیے کہ وہ قرآن کی زبان ہے۔ اس بات میں نہ تو دو رائے ہیں اور نہ ہی ہونے کی توقّع ہے۔ لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ باہمی تعارض کی صورت میں دونوں میں سے ترجیح کسے حاصل ہوگی؟

اس سلسلے میں علمائے اُمت نے سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی شارح کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور کیوں نہ کیا جائے کہ آیتِ کریمہ ﴿ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ ﴾[1] میں قرآن کی تبیین کو اہم ترین فریضہ رسالت بتلایا گیا ہے۔ اس بنا پر علمائے اسلام نے سنتِ نبوی کی تدوین میں خصوصی دلچسپی لی اور اس کی حجیت سے انکار کو در اصل تفسیر بالرّائے کا دروازہ کھولنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ علماء نے ایسے لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کیلئے اس کو لازم قرار دیا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ "الرّسالة" میں لکھتے ہیں:

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی فیصلہ فرمایا ہے، وہ قرآن سے سمجھ کر ہی صادر فرمایا۔"[2]

اسی بنا پر علماء نے تفسیر قرآن میں قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع کو لازم قرار دیا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن فہمی پر بحث کے دوران لکھتے ہیں:

"فإن أعياك ذلك فعليك بالسّنة، فإنها شارحة للقرآن وموضّحة له."[3]

"اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح اور اسے واضح کرنے والی ہے۔"

اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ » يعني: السنّة.[4]

---

[1] سورة النّحل: 16 : 44

[2] الشافعي، أبو عبد الله محمد بن إدريس، الرّسالة: ص91، مكتبة الحلبي، مصر، الطبعة الأولى، 1940م

[3] مقدّمة في أصول التّفسير: ص29

[4] السجستاني، أبو داؤد، سليمان بن الأشعث، سنن أبي داؤد، كتاب السّنة، باب في لزوم السّنة، 3988، قال الألباني: صحيح، انظر صحيح أبي داؤد: 4604، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1999م

خصوصاً قرآنِ کریم میں جس قدر آیاتِ احکام ہیں، ان کی تفسیر وتوضیح میں سنّت سے بے اعتنائی ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اُمت کی واضح اکثریت کی رائے میں سنّت کو لغت پر ترجیح حاصل ہو گی۔ کیونکہ جب نبی کریم ﷺ کسی لفظ کا مصداق متعین فرما دیں تو پھر دیگر تمام ذرائع بشمول لغوی معنی کے ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ومما ينبغي أن يُعلم أنّ الألفاظ الموجودة في القرآن والحديث إذا عرف تفسيرها وما أريد بها من جهة النّبي ﷺ لم يحتج في ذلك إلى الاستدلال بأقوال أهل اللّغة ولا غيرهم." [1]

" جس چیز کا جاننا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں موجود الفاظ کا مفہوم نبی اکرم ﷺ کی جانب سے معلوم ہو جائے تو اس میں اہلِ لغت وغیرہ کے اقوال سے استدلال کی حاجت نہیں رہتی۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت ان الفاظ کو کبھی مقید استعمال کرتی ہے، کبھی ان میں عموم اور کبھی تخصیص پیدا کرتی ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"والتّحقيق أنّ الشّارع لم ينقلها ولم يغيّرها ولكن استعملها مقيدةً لا مطلقةً كما يستعمل نظائرها كقوله تعالى: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ فذكر حجًّا خاصًّا وهو حجّ البيت، وكذلك قوله: ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ﴾ فلم يكن لفظ الحجّ متناولًا لكلّ قصد، بل لقصد مخصوص دلّ عليه اللفظ نفسه من غير تغيير اللّغة ... ومعلوم أنّ ذلك الحج المخصوص دلّت عليه الإضافة فكذلك الحجّ المخصوص الّذي أمر الله به دلّت عليه الإضافة أو التّعريف باللّام، فإذا قيل: "الحج فرض عليك" كانت لام العهد تبين أنه حجّ البيت." [2]

" شارع نے لغت میں استعمال ہونے والے الفاظ کو مطلق نہیں بلکہ مقید استعمال کیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ ہے۔ اس آیت میں خاص حج کا ذکر کیا اور وہ بیت اللہ کا حج ہے۔ اسی طرح فرمان الٰہی ہے: ﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ﴾ تو یہاں لفظِ حج ہر قصد اور ارادے کو شامل نہیں ہے بلکہ یہ خاص قسم کا قصد ہے، لغت میں بغیر کسی تبدیلی کے لفظ خود ہی اس پر دلالت کرتا ہے ... مخصوص حج جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو مضاف یا معرف باللّام کے طور پر ذکر کیا گیا۔ اگر یہ جملہ "الحجّ فرض عليك" (حج آپ پر فرض ہے) بولا جائے تو لفظ حج پر الف میں لام جو عہد کا ہے واضح کرتا ہے کہ حج سے مراد حج بیت اللہ ہے۔"

لغوی اور شرعی معنٰی متعارِض ہو تو عموماً شرعی معنی کو ہی ترجیح حاصل ہوتی ہے کیونکہ شریعت لغوی معانی یا

---

[1] مجموع فتاوى ابن تيمية: 7 / 286

[2] مجموع فتاوى ابن تيمية: 7 / 298، 299

مفاہیم کیلئے نازل نہیں ہوئی، البتہ اگر شرعی معنیٰ متعذر ہو تو لغویٰ معنی بھی لیا جاتا ہے۔ لیکن لغوی معنی مراد لینے کیلئے کوئی واضح قرینہ یا دلیل موجود ہونا ضروری ہے۔ امام زرکشی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1392ھ) لکھتے ہیں:

"أن تختلف أصل الحقيقة فيهما فيدور اللفظ بين معنيين، هو في أحدهما حقيقة لغوية وفي الآخر حقيقة شرعية، فالشّرعية أولى إلا أن تدلّ قرينته على إرادة اللّغوية."[1]

"اگر لفظ دو معانی کے درمیان گردش کر رہا ہو، ایک اعتبار سے لغوی معنی جبکہ دوسرے اعتبار سے شرعی معنی مراد لیا جا سکتا ہو تو شرعی معنیٰ مقدم ہو گا ہاں اگر کوئی ایسا قرینہ موجود ہو جو لغوی معنیٰ مراد لینے پر دلالت کرے تو لغوی معنیٰ مراد لیا جائے گا۔"

اس کی توجیہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شرعی احکام کی پہچان کروانے کیلئے مبعوث ہوئے ہیں، اور شرعی احکام کی معرفت آپ کے ذریعے سے ہی ہو سکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کی پہچان کروانے کیلئے مبعوث نہیں ہوئے جو اہلِ لغت کے ہاں معروف ہے، لہٰذا ضروری ٹھہرا کہ لفظ کو اسی معنی پر محمول کیا جائے جس میں بعثتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد سے مطابقت ہو۔[2]

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 852ھ) نے اس مسئلہ کو فتح الباری میں کئی مقامات پر ذکر کیا ہے، طیبی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 743ھ) کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"شارع کا کلام اس کے بیان اور وضاحت پر محمول کیا جائے گا کیونکہ اس کے مخاطب اہلِ زبان تھے گویا کہ ان باتوں کے ساتھ ان سے خطاب کیا گیا ہے جن کا علم ان کو شارع کی طرف سے ہی ملا ہے تو لفظ اسی معنیٰ پر محمول کیا جائے گا جس سے شرعی حکم کا پتا چلے۔"[3]

مزید فرماتے ہیں:

"أنّ ألفاظ الشّرع إذا دارت بين الحقيقة اللّغوية والشّرعية حملت على الشّرعية إلا إذا قام دليل."[4]

"الفاظِ شریعت جب لغوی اور شرعی معنی کے درمیان گھوم رہے ہوں تو ان کو شرعی حقیقت پر محمول کیا جائے البتہ اگر کوئی دلیل مل جائے تو ان کو لغوی حقیقت پر محمول کیا جائے گا۔"

---

[1] البُرهان: 2 / 167

[2] الآمدي، علي بن محمد، الإحكام في أصول الأحكام: 3 / 26، دار الكتاب العربي، بيروت، الطبعة الأولى، 1984م

[3] العسقلاني، أحمد بن علي بن حجر، فتح الباري شرح صحيح البخاري: 1/ 13، دار الكتاب العلمية، بيروت، الطبعة الثالثة، 2000م

[4] أيضاً

صوم کی بحث میں رقمطراز ہیں:

"وظاهره حمله على الحقيقة الشّرعية فيتمسّك به حتّى يدلّ دليل على أن المراد بالصّوم هنا حقيقته اللّغوية."[1]

"ظاہر یہی ہے کہ اس کو شرعی حقیقت پر محمول کیا جائے اور اسی کو اختیار کیا جائے حتیٰ کہ کوئی ایسی دلیل مل جائے جو اس پر دلالت کرے کہ یہاں صوم (روزے) کی لغوی حقیقت مراد ہے۔"

اس مسئلے کو ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ متفق علیہ مسئلہ کہتے ہیں:

"الحمل على الحقيقة الشّرعيّة مقدّم على اللغوية اتّفاقًا."[2]

"شرعی حقیقت پر محمول کرنا لغوی حقیقت پر محمول کرنے سے بالاتّفاق مقدم ہے۔"

شراب کے بارے میں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے منبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"إنّه قد نزل تحريمُ الخمرِ وهي من خمسةِ أشياءَ: العنبِ والتّمرِ والحنطةِ والشّعيرِ والعسلِ، والخمرُ ما خامر العقلَ." [3]

"شراب کی حرمت نازل ہو چکی یہ ان پانچ چیزوں سے بنتی ہے: انگور، کھجور، گندم، جو اور شہد۔ اور خمر سے مراد ہر وہ شے ہے جو عقل پر پردہ ڈال دے۔"

شریعت میں خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانپ دے، جبکہ لغت میں انگوروں سے نچوڑ کر حاصل کی گئی نشیلی چیز خمر کہلاتی ہے، اگرچہ اس میں اہل لغت کا اختلاف موجود ہے۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"لو سلم أن الخمر في اللّغة يختصّ بالمتّخذ من العنب فالاعتبار بالحقيقة الشّرعيّة وقد تواردت الأحاديث على أن المسكر من المتّخذ من غير العنب يسمّى خمرًا، والحقيقة الشّرعيّة مقدّمة على اللّغوية."[4]

"اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ خمر کا لفظ اسی کے ساتھ خاص ہے جو انگور سے حاصل کی جائے تو بھی حقیقتِ شرعیہ کا اعتبار کیا جائے گا اور اس بارے میں کئی احادیث ہیں کہ انگور کے علاوہ دوسری اشیاء سے حاصل کردہ نشیلی چیزوں کو بھی خمر کہا گیا ہے۔ حقیقتِ شرعیہ (شرعی معنیٰ) لغوی معنیٰ پر مقدم ہے۔"

---

[1] فتح الباري: 4 / 156

[2] فتح الباري: 9 / 168

[3] البخاري، أبو عبد الله محمد بن إسماعيل، صحيح البخاري، كتاب الأشربة، باب ماجاء في أن الخمر ما خامر العقل من الشّراب: 5588، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الثانية، 1999م

[4] فتح الباري: 10 / 47

راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 502ھ) خمر کی لغوی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اصل میں خمر کے معنیٰ کسی چیز کو چھپانے کے ہیں، اسی طرح خمار اصل میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھپائی جائے، مگر عرف میں صرف اوڑھنی پر بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع "خُمُر" آتی ہے، چنانچہ فرمانِ باری ہے: ﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ﴾[1] کہ وہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔ کہا جاتا ہے: اخْتَمَرَتِ المَرْءَةُ وَتَخَمَّرَتْ کہ خاتون نے سر پر اوڑھنی اوڑھ لی۔ خمرتُ الإناءَ کہ میں نے برتن ڈھانپ دیا۔ ایک روایت میں ہے: « خَمِّرُوا آنِيَتَكُمْ » کہ کھانے کے برتن ڈھانپ کر رکھا کرو۔ "أَخْمَرْتُ العَجِينَ" کہ میں نے گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر ڈالا۔ اور "خمیرۃ" کو "خمیرہ" اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اسے گوندھنے کے بعد خمیر اٹھانے کیلئے ڈھانپ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ "دخل في خمار النّاس" کہ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو کر چھپ گیا۔ الخمر شراب، نشہ، کیوں کہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ہر نشہ آور چیز پر خمر کا لفظ بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک صرف اسی چیز کو خمر کہا جاتا ہے جو انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ خمر (شراب حرام) صرف وہی ہے جو ان دو درختوں یعنی انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ "خمر" صرف اسی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو۔ پھر اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں کہ کس قدر پکانے کے بعد اس پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا۔"[2]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس بات پر کہ ہر نشہ آور چیز خمر ہے، اہل مدینہ، تمام حجازیوں اور سب محدثین کا اجماع نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"كل مسكر خمر وحكمه حكم ما اتّخذ من العنب، ومن الحجّة لهم أنّ القرآن لما نزل بتحريم الخمر فهم الصّحابة وهم أهل اللّسان أنّ كلّ شيء خمرا يدخل في النهي فأرا قوا المتّخذ من التّمر والرّطب ولم يخصّوا ذلك بالمتّخذ من العنب، وعلى تقدير التّسليم فإذا ثبت التسمية فإن تسمية كل مسكر خمرا من الشرع كان حقيقة شرعية وهي مقدمة على الحقيقة اللّغوية."[3]

"ہر نشہ آور چیز حرام ہے اور اس کا حکم بھی وہی ہے جو انگور سے حاصل کردہ خمر کا ہوتا ہے۔ انکی دلیل یہ ہے کہ جب قرآن خمر کی حرمت بیان کرنے کیلئے نازل ہوا تو صحابہ جو اہل زبان تھے وہ سمجھ گئے کہ ہر وہ چیز جس کو خمر کہا جاتا ہے اس ممانعت میں داخل ہے تو انہوں نے خشک اور تر کھجور سے کشید کردہ خمر کو بھی بہا دیا

---

[1] سورة النور: 24: 31

[2] الأصفهاني، أبو القاسم الحسين بن محمد، مُفردات ألفاظِ القرآن: 1/ 298، دار القلم، الدار الشامية، بيروت، الطبعة الأولى، 1412هـ

[3] فتح الباري: 10/ 48

تھا۔ انہوں نے انگور سے کشید کردہ خمر کو خاص نہیں کیا تھا۔ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی جب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہر نشہ آور چیز کو شرعاً خمر کہا جاتا ہے تو یہ معنیٰ لغوی حقیقت پر مقدّم ہو گا۔"

ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 463ھ) کہتے ہیں:

"إنّ الحكم إنّما يتعلّق بالاسم الشّرعي دون اللّغوي." [1]

"حکم شرعی اسم سے متعلّق ہوتا ہے نہ کہ لغوی اسم سے۔"

لغوی اور شرعی معنیٰ میں اختلاف کے مسئلے میں شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 2001ء) لکھتے ہیں:

"اگر شرعی اور لغوی معنیٰ میں اختلاف ہو جائے تو اس مفہوم کو لیا جائے گا جس کا شرعی معنی تقاضا کرتا ہے کیونکہ قرآن شریعت بیان کرنے کیلئے نازل ہوا ہے نہ کہ لغت کے بیان کیلئے۔ ہاں اگر کوئی ایسی دلیل موجود ہو جس سے لغوی معنیٰ راجح قرار پاتا ہو تو لغوی معنی کو لیا جائے گا۔ شرعی معنیٰ کو مقدّم ماننے کی مثال اللہ تعالیٰ کا منافقین کے بارے میں یہ فرمان ہے: ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا﴾ کہ ان میں سے کوئی مر جائے تو کبھی اس (کے جنازے) پر نماز نہ پڑھنا۔ لغت میں 'صلاۃ' سے مراد دُعا ہے اور شرعاً یہاں میت پر دُعا کیلئے مخصوص انداز سے کھڑے ہونا ہے، یعنی نماز جنازہ پڑھنا مراد ہے تو یہاں شرعی معنیٰ مقدّم ہو گا کیونکہ متکلّم (اللہ تعالیٰ) کو مخاطب کا عرف مقصد ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلّق ہے کہ منافقین کیلئے دُعا کرنا مطلقاً منع ہے تو یہ اس دلیل سے نہیں بلکہ دوسری دلیل سے ثابت ہوتا ہے۔" [2]

ایک لفظ کے دو معانی میں سے لغوی معنیٰ کو ترجیح دینے کی مثال اللہ جل جلالہ کا یہ فرمان ہے:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ [3]

"آپ ان کے اموال سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کر لیں جس سے آپ انہیں (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے ہیں اور ان کے حق میں دُعائے خیر کریں۔"

شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ آیت میں آنے والے لفظِ صلاۃ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس سے یہاں مراد دُعا ہے اسکی دلیل صحیح مسلم میں سیدنا عبد اللہ بن ابو اوفیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ جب کسی قوم کی طرف سے زکوٰۃ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچتی تو آپ ان کیلئے دُعا فرماتے۔ میرے والد اپنی زکوٰۃ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے دُعا فرمائی: « اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى آلِ أَبِي

---

[1] فتح الباري: 10 / 49

[2] العثيمين، محمد بن صالح، أصول في التّفسير: 1/ 27، المكتبة الإسلامية، الطبعة الأولى، 2001م

[3] سورة التّوبة: 9 : 103

أَوْفَى » کہ اے اللہ! ابو اوفیٰ کی آل پر رحمتیں نازل فرما۔" [1]

یہی وجہ ہے کہ شرعی اصطلاحات کو صرف لغت کی بنیاد پر نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ مقصدِ شارع معلوم نہ ہو۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1979ء) لکھتے ہیں:

"قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت ایسی مسائل موجود ہیں جنہیں ایک عربی دان آدمی محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مُدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جائے؟ مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہی کو لے لیجئے۔ قرآنِ مجید میں ایمان کے بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوٰۃ ہے لیکن محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم متعیّن نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کے اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد غالباً کوئی خاص فعل ہے جسے انجام دینے کا اہلِ ایمان سے مطالبہ کیا جارہا ہے، لیکن صرف قرآن پڑھ کر کوئی عربی دان یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے؟ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن بھیجنے والے نے اپنی طرف سے ایک معلّم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دُنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے ہو سکتے ہیں جو حکم صلوٰۃ پر عمل کرنے کی ایک شکل پر متّفق ہو جاتے؟" [2]

اسی بحث کے ضمن محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ 1962ء) فرماتے ہیں:

"قرآنِ مجید کے سمجھنے کیلئے صرف لغت کافی نہیں بلکہ حدیثِ نبوی یا تفسیر صحابہ کی بھی ضرورت ہے، کیونکہ لغت میں لفظ کے ایک معنیٰ ہوتے ہیں اور شرع اس سے اور معنیٰ مراد لیتی ہے۔ مثلاً لفظِ صلوٰۃ کے معنیٰ تحریک الصلوین کے ہیں۔ پس اگر ہم صرف لغت پر اکتفا کریں تو ایک حکمِ شرعی بھی ثابت نہ ہو گا۔" [3]

مزید فرماتے ہیں:

"لغت میں بعض الفاظ کے چند معانی لکھے ہیں، جیسے لفظ صلوٰۃ اور زکوٰۃ ہے۔ تو یہ کہاں سے معلوم ہو گا کہ آیتِ کریمہ ﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾ میں صلوٰۃ بمعنیٰ "عبادة فيها ركوع وسجود" اور زکوٰۃ بمعنیٰ "ما أخرجته من مالك لتطهره" مراد ہیں۔ شاید صلوٰۃ بمعنیٰ دُعا مراد ہو اور زکوٰۃ بمعنیٰ تطہیر نفس

---

[1] أصول في التّفسير: ص 32

[2] مودودی، سید ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن: 6 / 170، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، 1984ء

[3] روپڑی، حافظ عبد اللہ، محدث، درایتِ تفسیری: ص 45، 46، مطبع سٹیم پریس، امرتسر

مراد ہو؟ الغرض آیت دو معانی کے درمیان مشترک ہے۔ ایک کی تعیین بغیر مرجح کے نہیں ہو سکتی، پس کوئی مرجّح قائم کرنا چاہئے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا تعین سنتِ رسول ﷺ سے ہی ہو گا۔"[1]

بعض حضرات یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ حدیث قرآنِ مجید کی مفسر ہے اور اس کے مصداق کی تعیین کرتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ کبھی حدیث اسکے سیاق وسباق یا لغت ومحاورہ کے خلاف ہوتی ہے تو وہ حدیث قرآن کی مفسر نہیں ہو سکتی۔ سرسید احمد خان (متوفیٰ 1898ء) بھی اپنے ایک خط میں نواب محسن الملک (متوفیٰ 1907ء) کو لکھتے ہیں:

"اگر میری تفسیر کے کسی مقام کو خلافِ سیاق کلام اور خلافِ الفاظِ قرآن اور خلافِ محاورۂ عرب جاہلیت ثابت کر دو تو میں اسی وقت اپنی غلطی کا مقر ہو جاؤں گا، مگر مجاز وحقیقت میں یا استعارہ وکنایہ یا خطابیات میں بحث مت کرنا، کیونکہ جیسا تم کو کسی لفظ کے حقیقی یا مجازی معنیٰ لینے کا حق ہے ویسا ہی مجھ کو اس کے مجازی معنیٰ لینے یا استعارہ اور کنایہ یا از قسم خطابیات قرار دینے کا حق ہے۔"[2]

اس کے جواب میں محدث روپڑی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

" حدیث کے خلاف ہمارے متعین کردہ سیاق وسباق کی کوئی حیثیت نہیں۔ جس حدیث کو حاضرینِ وحی نے (جن کے سامنے قرآن اُترا اور جنہوں نے احادیثِ نبویہ اپنے کانوں سے سنیں) سیاق وسباق اور محاورۂ عرب کے خلاف نہیں گردانا، ہم کس طرح خلاف گردان سکتے ہیں۔ جو شخص کسی قضیہ میں حاضر ہو، جیسے وہ حقیقتِ حال کو سمجھتا ہے، غائب نہیں سمجھ سکتا۔ مشہور ہے:" الشاهد يرى ما لا يراه الغائب"۔ حدیث میں ہے: ليس الخبر كالمعاينة اس کے ساتھ وہ عرب العرباء تھے، بال کی کھال نکالتے تھے۔ اس زمانے کے محاورات گو آج تک کتابوں میں جمع ہیں، مگر وہ ان کو خوب جانتے تھے۔ قرآنِ مجید ان کے محاورہ کے مطابق اُترا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بالخصوص احسان جتا کر فرماتا ہے: ﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ﴾[3]

ظاہر میں تو یہ لوگ حدیث کو مانتے ہیں مگر جب کسی حدیث کو ردّ کرنا چاہتے ہیں یا کچھ اس کا مطلب الٹ پلٹ بیان کرنا چاہتے ہیں تو کسی آیت کا مطلب اپنے فہم سے بقواعدِ عربیہ بیان کر کے کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس آیت کے خلاف ہے، اس لئے معتبر نہیں۔ جب ان کو کہا جاتا ہے کہ جس حدیث کو صحابہ وتابعین نے آیت کے مخالف نہیں بنایا، تم کس طرح بناتے ہو، تم اس آیت کا معنیٰ وہی کرو جو صحابہ وتابعین نے کیا ہے تاکہ آیت وحدیث ایک

---

1 درایتِ تفسیری: ص 46

2 سرسید احمد خان، تفسیر القرآن مع تحریر في أصول التفسير: ص 5، 6، سٹیم پریس، لاہور

3 درایتِ تفسیری: ص 47

ہو جائیں، تو کہتے ہیں کہ اقوالِ سلف ہم پر حجت نہیں، چنانچہ قادیانی حدیث« لَا نَبِيَّ بَعْدِي »[1] کی بابت کہتے ہیں کہ اس سے مستقل یعنی صاحبِ کتاب نبی مراد ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ بعد کا لفظ مع (ساتھ) کے معنیٰ میں ہے۔ اور اس تاویل کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آیتِ کریمہ ﴿ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ﴾[2] اور آیتِ کریمہ ﴿ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ﴾[3] اور اس قسم کی دیگر آیات، بلکہ سورۂ احزاب کی آیت کریمہ ﴿ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ﴾[4] کے سیاق وسباق سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ اس لئے حدیث« لَا نَبِيَّ بَعْدِي » کی ضرور کوئی تاویل کرنی چاہئے یا اسے ردّ کر دینا چاہئے۔ اس طرح گویا یہ لوگ حدیث کو قواعدِ عربیہ پر مقدّم مان کر پھر قواعد عربیہ کی طرف لوٹ آتے ہیں، تو گویا ان کا ماننا برائے نام ہے۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ جب لغت اور سنّت کے درمیان تعارض کی صورت بن جائے تو سنت کو ترجیح حاصل ہو گی۔ کیونکہ سنت کو باری تعالیٰ نے خود قرآن کی مبین بتایا ہے جبکہ لغت کی حیثیت تفسیر قرآن میں معاون کی ہے اور بس۔

سنت اور لغت میں تعارض کی صورت میں معیار

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ادبِ جاہلی تفسیر قرآن کا اہم ذریعہ ہے، اور یہ تفسیر قرآن کے اصلی اور قطعی اصول کی حیثیت سے تفسیر قرآن بذریعہ قرآن میں شامل ہے، گویا قرآن کی تفسیر میں اسے اصل اور اساس کی حیثیت حاصل ہے، جبکہ حدیث وسنت اور اقوالِ صحابہ تفسیر قرآن کے ثانوی اور فرعی ماخذ ہیں، جو اصلی اور اساسی مآخذ کی تائید و تصدیق تو کر سکتے ہیں، لیکن تعارض کی صورت میں معیار لغت اور ادب جاہلی ہی ہو گا، اور اس صورت میں احادیث مبارکہ کو یا تو ردّ کر دیا جائے گا یا ان کی تاویل کی جائے گی۔

مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں:

"من المأخذ ما هو أصل وإمام، ومنها ما هو كالفرع والتبع. أما الإمام والأساس فليس إلا القرآن نفسه، وأمّا ما هو كالتّبع والفرع فذلك ثلاثة: ما تلقّته علماء الأمة من الأحاديث النبوية، وما ثبت واجتمعت الأمة عليه من أحوال الأمم، وما استحفظ من الكتب المنزلة على الأنبياء.

ولولا تطرّق الظن والشبهة إلى الأحاديث والتاريخ، والكتب المنزلة من قبل لما جعلناها كالفرع، بل كان كل ذلك أصلا ثابتا يعضد بعضه بعضا من غير مخالفة."[5]

---

[1] صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب ما ذكر عن بني إسرائيل: 3455

[2] سورة البقرة: 2 : 4

[3] سورة الأعراف: 7 : 35

[4] سورة الأحزاب: 33 : 40

[5] تفسير نظام القرآن: فاتحة نظام القرآن، ص28

"بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی۔ اصل و اساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں: 1۔ وہ احادیثِ نبویہ جن کو علمائے امت نے قبول کیا، 2۔ قوموں کے ثابت شدہ و متفق علیہ حالات 3۔ اور گذشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔ اگر ان تینوں میں ظن اور شبہ کو دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی اور سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔"

مولانا اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا تمام تر اعتماد کلامِ عرب پر تھا۔ وہ جس لفظ یا جس اسلوب کے بارے میں متردّد ہوتے، اس کو صرف قرآنِ مجید اور کلامِ عرب میں ڈھونڈتے۔ بعض الفاظ و اسالیب کی تلاش میں انہوں نے مدّتیں صرف کر دیں۔ ان کی کتب "اسالیب القرآن" اور "مفردات القرآن" میں اس سلسلہ کے تمام معرکے ملیں گے۔ ﴿غُثَآءً اَحْوٰى﴾[1] میں لفظ ﴿غُثَآءً﴾ کے بارے میں مولانا خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کے صحیح مفہوم کی تحقیق میں برسوں صرف کر دیئے۔ اس لفظ کے بارے میں ان کو تمام اہلِ لغت اور اربابِ تفسیر سے اختلاف تھا، چنانچہ ایک مدت تک وہ اس کی تحقیق میں کلامِ عرب کا ذخیرہ چھانتے رہے۔"[2]

دوسری طرف جمہور اہلِ علم کا طریقۂ تفسیر بیان کرتے ہوئے امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"تفسیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر، خود قرآن سے کی جائے۔ قرآن میں جو مضمون ایک جگہ مجمل ہے، دوسری جگہ مفصل ملے گا، اور جہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے، دوسری جگہ اس کی تفصیل مل جائے گا اور اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے جو قرآن کی شرح و تفسیر کرتی ہے، بلکہ امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بھی حکم دیا ہے، وہ قرآن ہی سے ماخوذ ہے۔"[3]

اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَاۗىِٕنِيْنَ خَصِيْمًا ۝﴾[4]

"یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے

[1] سورة الأعلى: 87: 5

[2] مبادیٔ تدبّرِ قرآن: ص 67، 68

[3] مقدمة في أصول التفسير: ص29

[4] سورة النّساء: 4 : 105

مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ نے تم کو شناسا کیا ہے اور خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۝۴۴﴾ [1]

" اور ہم نے یہ کتاب تیری طرف اُتاری تاکہ وضاحت کرے تو لوگوں کیلئے ان مضامین کی جو ان کی طرف اتارے گئے ہیں، اور تاکہ وہ غور کیا کریں۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ۙ وَ هُدًی وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۝۶۴﴾ [2]

" ہم نے تم پر (اے نبی ﷺ) یہ کتاب اسی لئے نازل کی ہے کہ تم کھول کر بتادو ان کو وہ باتیں جن میں یہ باہم مختلف ہیں اور نیز یہ ہدایت اور رحمت ہے، ایمان والوں کیلئے۔"

اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

« أَلَا إِنِّي أُوتِيتُ الْقُرْآنَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ » [3]

" معلوم رہے کہ مجھے قرآن بھی بخشا گیا ہے اور قرآن کے ساتھ اس کا مثل بھی۔"

اور یہ مثلِ قرآن 'سنت' ہے۔ سنت بھی نازل ہوتی تھی، البتہ قرآن کی طرح اس کی تلاوت نہیں رکھی گئی۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"ذا حدّثتكم بحديث أنباتكم بتصديقه من كتاب الله." [4]

"میں تمہیں کوئی حدیث بیان کروں تو اس کی تصدیق تمہیں قرآن کریم سے بتا سکتا ہوں۔"

سعید بن جبیر رحمہ اللہ (متوفی 95ھ) فرماتے ہیں:

"ما بلغني حديث عن رسول الله على وجهه إلا وجدت مصداقه في كتاب الله." [5]

" مجھے رسول اللہ ﷺ سے جو بھی روایت کسی بھی پہلو سے ملی میں نے اس کا مصداق کتاب اللہ میں پایا ہے۔"

---

[1] سورة النّحل: 16 : 44

[2] سورة النّحل: 16 : 64

[3] سنن أبي داؤد، كتاب السّنة، باب في لزوم السّنة، 4604، قال الألباني: صحيح، انظر صحيح أبي داؤد: 4604

[4] ملا علي قاري، علي بن سلطان، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح: 1/ 250، دار الفكر، بيروت، الطبعة الأولى، 2002م

[5] أيضاً

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جميع ما تقوله الأمّة شرح للسّنة وجميع السّنة شرح للقران."[1]

"علمائے امت کی تمام باتیں سنت کی شرح ہیں، اور تمام سنت قرآن کی شرح ہے۔"

یہی اندازِ تفسیر صائب ہے کیونکہ قرآنِ مجید کے اکثر معانی و مفاہیم اور مدلولات کو حدیث و سنت سے متعین کر دیا گیا ہے۔ اور ان معانی و مفاہیم کے تعین کی ذمہ داری آیتِ کریمہ ﴿وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾[2] کے مصداق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1999ء) فرماتے ہیں:

"اس آیت میں جس 'بیان' کا ذکر ہوا ہے وہ دراصل سنتِ مطہرہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے فہم قرآن کیلئے اہلِ عرب کی زبان دانی کو معیار نہیں بنایا، باوجود اس کے کہ وہ انتہائی فصیح اللّسان تھے۔ چنانچہ ایسے عجمی جو چند دن عرب میں رہ گئے یا عربی زبان سیکھ لی، ان کے 'تبحرِ علمی' کو وضاحتِ قرآن کیلئے کیونکر قابلِ اعتماد ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ جبکہ عصر حاضر میں اس دور سے زیادہ 'بیانِ قرآن' کی ضرورت ہے۔"

آیتِ مذکورہ میں 'بیان' سے مراد وہ وحی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر القاء فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کی ایک وحی ایسی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے متلوّ اور متعبد بنایا ہے، جس کا ماحصل قرآنِ کریم ہے۔ دوسری وہ وحی ہے جو قرآنِ حکیم کی طرح متلوّ تو نہیں، لیکن اس کی حفاظت ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے بغیر قرآنِ حکیم کے مکمل فہم کی کوئی صورت ہی نہیں۔ لہٰذا وہ وحی جو قرآنِ مجید کی صحیح وضاحت کرتی ہے، قرآن پاک ہی کہلائے گی اور یہی وہ وضاحت ہے جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں صریحاً مکلّف بنایا گیا ہے۔"[3]

تفسیر قرآن کا اہم ذریعہ: حدیث!

قرآنِ مجید کو صرف لغت سے نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قرآن کی تفسیر کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی راہنمائی کی ذرہ برابر ضرورت نہ رہتی۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمیشہ قرآن کی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی لیتے تھے اور جب کبھی حضراتِ صحابہ نے اپنے طور پر صرف لغت سے الفاظِ قرآن کا مفہوم متعین کرنا چاہا تو ایسی ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑا جیسے آج کے 'اہل قرآن' مفسرین کو کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی

---

1 الإتقان في علوم القرآن: 2 / 330

2 سورة النّحل: 16 : 44

3 حسن مدنی، حافظ، ڈاکٹر، قرآن فہمی کے بنیادی اصول، نامور مفسر کے قلم سے: ص 100، مجلس التحقیق الاسلامی، لاہور، 2005ء

چند ایک امثلہ درج ذیل ہیں:

صحیح بخاری میں سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ (متوفی 66ھ) کا معروف قصّہ موجود ہے کہ جب رمضان المبارک میں سحری کا حکم نازل ہوا کہ اس وقت تک سحری میں کھاپی سکتے ہو جب تک سفید اور سیاہ دھاریاں الگ الگ ظاہر نہ ہو جائیں۔ یہاں قرآنِ کریم کی مراد طلوعِ فجر کے وقت مشرق کی جانب آسمان پر نظر آنے والی سفید روشنی اور سیاہ اندھیرے کی دھاریاں ہیں جن کا الگ الگ نظر آنا طلوعِ فجر کی علامت ہے اور اسی کے ساتھ سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے، مگر عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے یہ کیا کہ دھاگے کی سفید اور سیاہ ڈوریاں اپنے تکیہ کے نیچے رکھ لیں اور سحری کے وقت انہیں دیکھ کر کھاتے پیتے رہتے اور جب وہ الگ الگ دکھائی دینے لگیں تو کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ ایک روز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا:

«إِنَّ وِسَادَكَ إِذًا لَعَرِيضٌ أَنْ كَانَ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ وَالْأَسْوَدُ تَحْتَ وِسَادَتِكَ »[1]

"اگر سفید اور سیاہ دھاری تمہارے تکیے کے نیچے آجائے تو پھر تو تمہارا تکیہ بہت ہی چوڑا ہے۔ اس کے بعد سیدنا عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ بات کو سمجھے اور تکیہ کے نیچے سے دھاگے کی ڈوریاں نکال لیں۔"

غور طلب بات یہ ہے کہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ عربی ہیں اور عربی کے بیٹے ہیں، سردار ہیں اور سردار کے بیٹے ہیں مگر قرآنِ کریم کا بیان کردہ محاورہ سمجھنے میں غلطی لگ گئی اور اس وقت قرآنِ کریم کا مطلب نہیں سمجھ پائے جب تک خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت نہیں فرمادی۔ اس لئے اگر آج کوئی عربی یا عجمی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ محض 'عربی دانی' کے زور پر قرآنِ کریم کا مفہوم ومراد کو پاسکتا ہے تو یہ بات کیسے قبول کی جاسکتی ہے؟

یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک شخصی واقعہ ہے اور کسی بھی شخص کو ذاتی طور پر اس قسم کا مغالطہ ہو سکتا ہے، اس لئے ایک اجتماعی مثال بھی حسبِ ذیل ہے۔

حدیث مبارکہ میں ہے کہ جب سورۂ انعام کی حسب ذیل آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ ﴾[2] "جو لوگ ایمان لائے پھر اپنے ایمان کو ظلم (شرک) سے آلودہ نہیں کیا۔ انہی کیلئے امن وسلامتی ہے اور یہی لوگ راہ راست پر ہیں۔" تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بے چینی پھیل گئی۔ انہوں نے ظلم کا عام مفہوم سمجھا کہ لوگوں میں باہمی معاملات وحقوق اور لین دین میں جو کمی بیشی اور حق تلفی ہو جاتی ہے وہ ظلم ہے، اور بلاشبہ 'ظلم' کا عمومی مفہوم یہی ہے۔ انہیں پریشانی اس بات پر ہوئی کہ یہ کمی بیشی تو انسانی معاشرت کا حصہ ہے اور روزمرہ کے معاملات میں کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتی ہے، اس سے

---

[1] صحيح البخاري: كتاب تفسير القرآن، باب قوله: ﴿ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾، 4509

[2] سورة الأنعام :6: 28

مکمل گریز کو اگر ایمان وہدایت کیلئے شرط قرار دیا جائے تو بہت کم لوگوں کا ایمان قبولیت کے معیار پر پورا اُترے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پریشانی اس حد تک بڑھی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ حضرات پیش ہوئے اور اپنے اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کیا: وأينا لم يظلم يا رسول الله!؟ "یارسول اللہ! ہم میں سے کون ہے جس سے تھوڑی بہت زیادتی نہیں ہوتی؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا:

« لَيْسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّونَ، إِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ: ﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۖ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾[1]

"یہ وہ ظلم نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، بلکہ اس سے مراد وہ ہے جو لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو (نصیحت کرتے ہوئے) کہا تھا کہ اے میرے پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا، یقیناً شرک تو بہت بڑا ظلم ہے۔"

اب قرآنِ کریم میں عام طور پر بولا جانے والا ایک لفظ استعمال ہوتا ہے اور مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب عرب بلکہ عربی کے امام ہیں، جن کے محاورہ کے مطابق قرآنِ کریم نازل ہوا ہے، مگر انہیں لفظ کی مراد سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور وہ اس وقت ہی قرآنِ کریم کا مقصد پاسکے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی۔

جب آیتِ کریمہ نازل ہوئی: ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾[2] "جس نے برائی کا کوئی کام کیا تو اسے ضرور اس کا بدلہ دیا جائے گا۔" تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سخت پریشان ہوگئے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« قَارِبُوا وَسَدِّدُوا فَفِي كُلِّ مَا يُصَابُ بِهِ الْمُسْلِمُ كَفَّارَةٌ حَتَّى النُّكْبَةِ يُنْكَبُهَا أَوِ الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا »[3]

"ایک دوسرے کے قریب رہو اور اور سچی بات پر ڈٹے رہو، اس دنیا میں بھی اہل ایمان کو جو تکالیف اور پریشانیاں پیش آتی ہیں، وہ ان کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ بن جاتی ہیں حتیٰ کہ کسی مومن کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ اس کے لئے کفارہ بن جاتا ہے۔"

بعض روایات میں یہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے،[4] تو سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نسلی عرب ہیں،

---

[1] صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قوله تعالى: ﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ﴾، 3428

[2] سورة النساء: 4: 123

[3] النيسابوري، مسلم بن الحجاج، صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب ثواب المؤمن فيما يصيبه من مرض أو حزن أو نحو ذلك: 2574، دار السلام للنشر والتوزيع، الرياض، الطبعة الأولى، 1998م

[4] ابن كثير، ابو الفداء، اسماعيل بن عمر بن كثير، تفسير القرآن العظيم: 369/2، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1419ھ، حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے سورۂ نساء کی اس آیت کریمہ (نمبر 123) کی تفسیر میں اسے سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔

ان کی مادری زبان عربی ہے، انہیں" أعلم الصحابه "کہا جاتا ہے مگر قرآنِ کریم کی ایک آیتِ کریمہ کا مفہوم نہیں سمجھ پائے اور نبی اکرم ﷺ نے وضاحت فرمائی تو بات ان کی سمجھ میں آئی ہے۔

اسی لیے امام ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"میرا دعویٰ ہے کہ چاہے کوئی عربی کا بہت بڑا ماہر ہو یا فہم وادراک میں یکتا ہو، ماہر لسانیات ہو، وضاحت وتشریح کی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہو۔ وحی غیر متلوّ (سنتِ مطہرہ) کے بغیر قرآنِ مجید کے اصل مفہوم کو مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے زیادہ اور کون ہے جو لغتِ عرب کو سمجھنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ ان کی مادری زبان عربی میں ہی قرآن حکیم نازل ہوا، پھر بھی کئی آیات کے مطالب کو سمجھنا ان کیلئے ناممکن ہو گیا۔ مجبوراً انہیں سمجھنے کیلئے نبی اکرم ﷺ کی طرف ہی رجوع کرنا پڑا۔"[1]

یہ بات بڑی قابل تعجّب ہے کہ جب ایک شخص رسول اللہ ﷺ کو متنِ قرآن کی روایت میں اتھارٹی تسلیم کرتا ہے تو ان کے ارشادات وفرمودات کو بطور تفسیر قرآن تسلیم کرنے میں کیا مانع ہے؟

تفسیر قرآن بذریعہ اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم

علمائے مفسرین نے اُصول مقرر کیا ہے کہ جب قرآن پاک کی تفسیر قرآن اور حدیث سے نہ ملے تو پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال سے لینی چاہئے، اس لئے کہ انہوں نے احوال وقرائن اس وقت کے دیکھے بھالے ہیں۔ وہ نزول قرآن کے وقت حاضر وموجود ہوتے تھے۔ فہم تام، علم صحیح، عمل صالح رکھتے تھے اور یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر بیان کریں اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کو سنا نہ ہو۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انہوں نے نہیں سنا تو بھی وہ ان علماء میں ہیں جو لغتِ عرب کی تل تل سے واقف تھے، بال کی کھال نکالتے تھے۔ خصوصاً جو ان میں بڑے بڑے عالم تھے، جیسے خلفائے اربعہ، ابن مسعود، ابن عباس، اُبی بن کعب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، عبد اللہ بن زبیر اور ان کے علاوہ انس بن مالک، عائشہ صدیقہ، ابو ہریرہ، ابن عمر، جابر بن عبد اللہ وغیرہم رضی اللہ عنہم۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"والذي لا إله غيره، ما نزلت آية في كتاب الله إلا وأنا أعلم فيمَ نزلت؟ وأينَ أنزلت؟ ولو أعلم مكانَ أحدٍ أعلمَ بكتاب الله مِنّى تنالُه المطايا لأتيته."[2]

"اس رب کی قسم جس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں! نہیں اُتری کوئی آیت کتاب اللہ کی مگر مجھے معلوم ہے کہ کس کے حق میں اتری ہے اور کہاں اتری ہے؟ اگر میں جانوں کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ قرآن جانتا

[1] قرآن فہمی کے بنیادی اسباب: ص 101

[2] جامع البيان: 1 / 80

ہے اور میں اس تک پہنچ سکتا ہوں تو میں ضرور اس کے پاس پہنچوں گا۔"

اسی طرح فرمایا:

"كانَ الرجل مِنَّا إذا تعلَّم عَشْرَ آياتٍ لم يجاوزهُنّ حتّى يعرف معانيَهُنَّ، والعملَ بِهِنَّ."[1]

"جو کوئی ہم میں سے دس آیات سیکھ لیتا تھا جب تک وہ اسکے معنی نہ پہچان لیتا اور اس پر عمل نہ کر لیتا، تب تک آگے نہ بڑھتا۔"

واضح رہے کہ تفسیر قرآن میں اقوالِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی تین اقسام ہیں:

1. مرفوع حکمی روایات

مرفوع حکمی روایات سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ اقوال ہیں جن میں عقل ورائے اور اسرائیلیات وغیرہ کا دخل نہ ہو۔ گویا یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ تفسیری اقوال ہیں جو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے اور سیکھے، لیکن پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیے بغیر آگے اُمّت تک پہنچا دیئے۔ ارباب تفسیر اور محدثین نے بالاجماع انہیں بھی حدیثِ مرفوع ہی کے حکم میں داخل کیا ہے، علمائے کرام نے وضاحت سے لکھا ہے:

"أنّ قول الصّحابي ما لا مجال للرّأي فيه ولم يعرف بالأخذ عن الإسرائيليات حكمه حكم المرفوع."[2]

"اسرائیلیات سے استفادہ نہ کرنے والے صحابی کا وہ قول جس میں رائے کا احتمال نہ ہو حکماً مرفوع ہوتا ہے۔"

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے وہ تفسیری اقوال جن میں عقل و رائے اور اسرائیلیات وغیرہ کا دخل نہ ہو، بالاتّفاق حدیثِ مرفوع کا درجہ رکھتے ہیں اور فرمانِ باری تعالیٰ ﴿وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾[3] کے مطابق تفسیر قرآن کا بنیادی ماخذ ہیں۔

2. تفسیر اجتہادی

تفسیر اجتہادی سے مراد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآنِ کریم سے وہ استدلال اور گہرا استنباط ہے جس کی بنیاد لغت کا سرسری معنیٰ نہیں ہوتا۔ جیسے فحوائے سیاق کلام سے کسی مطلب پر مطلع ہونا یا دو تین باتوں کو ملا کر ان سے ایک مناسب نتیجہ نکالنا یا مقتضائے حال اور وضع متکلم کو دیکھ کر اس سے کوئی بات اور نتیجہ نکالنا وغیرہ۔

---

[1] جامع البيان: 1 / 80

[2] حسن محمد أيوب، الحديث في علوم القرآن والحديث: ص 29، دار السلام، الاسكندرية، الطبعة الثانية، 2004م

[3] سورة النّحل: 16 : 44

مثلاً عدالت میں بیانِ واقعات کے بعد قاضی نتیجہ نکال کر جو فیصلہ کرتا ہے، اسے درایت اجتہادی کہتے ہیں۔ اسی طرح بھنگ، چرس اور افیون وغیرہ کو نشہ کی وجہ سے شراب پر قیاس کر کے حرام قرار دینا۔ اسی طرح آیتِ کریمہ ﴿ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۚ ﴾ [1] سے کفار کے صحتِ نکاح کا مسئلہ نکالنا یعنی ان کے آپس میں نکاح صحیح ہیں۔ اسی طرح آیتِ کریمہ ﴿ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ ﴾ [2] اور آیتِ کریمہ ﴿ وَّفِصٰلُهٗ فِیْ عَامَیْنِ ﴾ [3] دونوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالنا کہ اقل مدّتِ حمل چھ ماہ ہے (کیونکہ تیس مہینوں سے دو سال نکالنے سے باقی چھ ماہ باقی بچ جاتے ہیں۔)

صحابہ کی ایسی تفسیر کی اہمیت بھی واضح ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ ان کے مربّی ومزکّی تھے، آپ ﷺ کی صحبت اور مجالس سے وہ ہر ممکن استفادہ کرتے تھے، وحی کے نزول کے وقت حاضر ہوتے تھے، کئی واقعات، جن پر قرآن کریم اترتا تھا، میں بذاتِ خود شریک ہوتے تھے۔ سلیم القلب، فہم تام، علم صحیح اور عمل صالح کے مالک تھے۔ اس زمانہ کے محاورات کو خوب جانتے تھے، قرآن پاک ان کے محاورہ کے مطابق اترا۔

ہمیں اپنی زبان کے محاورات اور بول چال کی طرف خیال کرنا چاہئے کہ ایک دوسرے کے مافی الضمیر پر کس طرح آسانی سے اطلاع پاتے ہیں، اسی طرح صحابہ کرام قرآن پاک کے مضامین کو آسانی سے سمجھتے تھے کیونکہ قرآنِ مجید فصاحت وبلاغت کے اعلیٰ پایہ پر اُترا ہے۔ کمالِ فصاحت اسی میں ہے کہ معنی مراد کو ایسی سلاست اور روانگی سے مقتضائے حال کے مطابق ادا کیا جائے کہ الفاظ منہ سے نکلتے ہی معنی مراد دل میں نقش ہو جائیں۔ جس کلام کا معنی مراد ہی متعیّن نہ ہو تو ایسی مشتبہ اور مبہم کلام کو بھی کون فصیح وبلیغ کہہ سکتا ہے؟ جس شخص کا یہ خیال ہو کہ قرآن پاک کا معنی مراد ہی متعین نہیں ہوتا اور جو آتا ہے اس سے نیا مطلب سمجھتا ہے اور اس کے اصلی معنی سے ایک شخص نہیں دو نہیں بلکہ سینکڑوں حاضرین وحی غفلت کر جاتے ہیں، ایسا شخص در اصل قرآنِ پاک کی فصاحت وبلاغت پر ایمان نہیں رکھتا۔ "مختصر المعانی" میں ہے:

"فالبلاغة صفة راجعة إلى اللفظ يعني أنه يقال: كلام بليغ لكن لا من حيث أنه لفظ وصوت، بل باعتبار إفادته المعنى أي الغرض المصوغ له الكلام بالتركيب." [4]

"بلاغت لفظ کی صفت ہے، مگر محض لفظ اور آواز ہونے کے لحاظ سے صفت نہیں بلکہ اس لحاظ سے کہ لفظ معنی مراد کو ادا کرے۔ یعنی اگر لفظ معنی مراد کو ادا نہ کرے تو بلاغت کے متصف نہیں ہو سکتا۔"

---

[1] سورة المسد: 111 : 4

[2] سورة الأحقاف: 46 : 15

[3] سورة لقمان: 31 : 14

[4] التفتازاني، سعد الدين مسعود بن عمر، مختصر المعاني: ص17، دار الفكر، قم، الطبعة الأولى، 1411هـ

ان وجوہات کی بناء پر قرآنِ کریم کی تفسیر اجتہادی میں ان کا اور بعد میں آنے والوں کے استدلالات واستنباطات کا فرق اظہر من الشمس ہے۔ اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر اجتہادی کی حجیّت میں علمائے امت کے مابین اختلاف موجود ہے، لیکن بہر حال ان کی اس تفسیر کی قسم کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔

3. تفسیر لغوی

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفسیر لغوی کلام کے ظاہری مطلب کو کہتے ہیں جس کو اہل زبان اپنے محاورہ میں بے تکلّف سمجھتے اور استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے بول چال میں ایک دوسرے کے مافی الضمیر پر اس کے کلام سے بے تکلف آگاہ ہو جاتے ہیں اور اس کا مطلب سمجھنے سے کوئی چیز حائل نہیں ہوتی، اگر بالفرض کسی موقع پر اشتراکِ لفظی یا کسی اور عارضہ کی وجہ سے لفظوں سے ظاہری مطلب نہ سمجھا جائے تو سیاق وسباق اور قرائن وغیرہ متکلّم کی مراد کو ظاہر کر دیتے ہیں۔

اگر متکلّم اپنے ما فی الضمیر پر اطلاع دینے کی خاطر ایک بات کرے اور مخاطب باوجود اہل زبان ہونے کے اس کے مفہوم و مراد کو نہ اس کے الفاظ سے سمجھ سکے اور نہ قرائن وغیرہ سے تو وہ کلام سطحی ہے یا یہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ساقط ہے، کیونکہ کلام کے بلیغ ہونے کا یہ معنیٰ ہے کہ فصیح ہونے کے ساتھ مقتضیٰ حال کے موافق ہو۔ پھر مقتضیٰ حال مختلف ہیں کیونکہ مواضعِ کلام مختلف ہیں مثلاً بعض جگہ تنکیر مناسب ہے اور بعض جگہ تعریف۔ بعض جگہ اطلاق اور بعض جگہ تقیید، بعض جگہ لفظ کو مقدّم کرنا اور بعض جگہ موخّر، بعض جگہ ذکر کرنا اور بعض جگہ حذف، بعض جگہ کلام کو مختصر کرنا اور بعض جگہ طویل اور بعض جگہ عطف کرنا اور بعض جگہ ترکِ عطف، یعنی جیسا محل ہے اگر ویسی کلام کی جائے تو اچھی ہے ورنہ بری۔

مثلاً اگر اختصار کا محل ہے تو کلام کو مختصر کرنا چاہئے اگر طول کا محل ہے تو طول دینا چاہئے اسی طرح اگر 'ذکی' سے ہم کلام ہو تو اعتبارات لطیفہ مناسب ہیں ورنہ عام اور موٹی بات کرے۔ الغرض مذکورہ بالا باتوں کی جس قدر رعایت کی جائے، کلام اسی قدر بلیغ ہوتی ہے۔ اگر مذکورہ بالا باتوں کی رعایت نہ کی جائے تو وہ کلام بلیغ نہیں ہو سکتی۔ اس کلام سے ظاہر ہوا کہ مخاطب کی ذکاوت، غباوت کا لحاظ رکھنا مفہومِ بلاغت میں داخل ہے۔ پس جو شخص ذکی کے ساتھ غبی کا خطاب کرے یا غبی کے ساتھ ذکی کا خطاب کرے، وہ بلیغ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے یہ بات ناممکن ہے کہ ہزارہا صحابہ رضی اللہ عنہم حاضرین مجلس کسی آیت کے اصل مطلب سے غفلت کر جائیں اور کسی کی سمجھ میں صحیح مطلب نہ آئے، کیونکہ اصل مخاطب وہی تھے اور انہیں کی خاطر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید عربی زبان میں اُتارا چنانچہ بالخصوص ان کو خطاب کر کے بطور احسان فرمایا:

﴿إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝﴾ [1]

[1] سورة يوسف: 12 : 2

"تحقیق اتارا ہم نے اس کو قرآن عربی تا کہ تم سمجھو۔"

گویا جو اس کے خلاف اعتقاد رکھتے ہیں وہ قرآن پاک کی فصاحت وبلاغت پر ایمان نہیں لائے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح اور قرین انصاف معلوم ہوتی ہے کہ جس کو حاضرین وحی نے (جن کے سامنے قرآن پاک اترا اور جنہوں نے احادیث نبوی اپنے کانوں سے سنیں) سیاق وسباق اور محاورہ عرب کے خلاف نہیں گردانا، وہ ہرگز ہرگز سیاق وسباق اور محاورۂ عرب کے خلاف نہیں۔

تفسیر صحابی کی یہ قسم، جسے درایت تفسیری کہا جاتا ہے، اگرچہ مرفوع حکمی روایات کی طرح وحی تو نہیں، لیکن حجّت ہے، جس کے دلائل حسبِ ذیل ہیں۔ اس فصل میں ہمارا مقصود بھی یہی قسم ہے۔

محاورہ صحابہ کی اہمیت کے دلائل

کچھ عرصہ پہلے بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ مشکل ہیں، انہیں سمجھنا ہمارے بس کی بات نہیں بلکہ یہ تو ائمہ دین کا ہی کام ہے اور علمائے کرام ہمیشہ ان کے مقابلے میں یہ کہتے آئے تھے کہ قرآن وحدیث کوئی چیستاں تو نہیں کہ ان کا سادہ اور ظاہری مطلب بھی سمجھ میں نہ آئے بلکہ یہ تو فصیح عربی زبان میں ہیں لہٰذا جو شخص عربی زبان سیکھ لے تو وہ قرآن وحدیث کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۝ ﴾[1]

خصوصیاتِ الفاظ سے تعلّق رکھنے والے معانی ومفاہیم کو سمجھنا اگرچہ ایک مشکل اَمر ہے لیکن کلام کا ظاہری معنی اور غرضِ متکلّم سمجھنا تو بلاشبہ، مشکل کام نہیں۔ اگر یہ بھی کسی کو سمجھ میں نہ آسکیں تو قرآن وحدیث کو فصیح و بلیغ کہنا چہ معنی دارد؟ فرمانِ باری ہے: ﴿ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ ﴾[2]

ابھی یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تھا کہ ایک اور گروہ سامنے آیا۔ ان کا کہنا ہے کہ عین ممکن ہے ہزارہا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جو مجلسِ نبوی میں بیٹھتے اور براہ راست پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دامن کو انوارِ شریعت سے بھرتے تھے اور جن کی ہدایت ودرایت پر پوری اُمت متفق ہے، کو ایک آیت کی تفسیر سمجھ نہ آئی ہو اور وہ اس میں غلطی کر گئے ہوں لیکن ہم نے اس کا صحیح مفہوم سمجھا ہو۔ گویا ان کے نزدیک قرآن کریم کا ظاہری مفہوم بھی اتنا مشکل ہے کہ ایک دو امام نہیں بلکہ ہزاروں ائمہ اس سے غفلت کر جاتے ہیں پھر بایں ہمہ قرآن کریم کی فصاحت وبلاغت پر بھی ایمان کا دعوی کرتے ہیں۔

جو لوگ تفسیر صحابہ کی حجیّت کے منکر ہیں وہ دراصل، زبان حال سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مجلس پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم میں بیٹھنے والے سینکڑوں صحابہ رضی اللہ عنہم، جن میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم، حبر الامّۃ کا لقب پانے والے عبد اللہ بن

---

[1] سورة القمر: 54 : 17

[2] سورة يوسف: 12 : 2

عباس رضی اللہ عنہ، بہت بڑے فقیہ عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور أقرأ الصّحابة اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں، قرآنِ کریم کے ظاہری معنیٰ میں غلطی کر جاتے ہیں، لہٰذا ہم ان کی تفسیر کے پابند نہیں۔ ان کے اس دعویٰ میں پوری امت ان کے کی مخالف ہے کوئی بھی عقلمند، صاحب ایمان اس قسم کی بات تسلیم نہیں کر سکتا۔

ہم مثالوں کے ذریعے اس بات کی وضاحت کی کوشش کرتے ہیں:

مثال نمبر1: اگر کوئی ایسا شخص جس کی اپنی زبان اُردو ہو اور وہ عربی زبان کو سیکھ کر اس میں بھی خوب مہارت پیدا کر لے، پھر اگر وہ عربی اخبار کا مطالعہ کر کے اس میں موجود کسی خبر سے کوئی استدلال کرے تو اس کا یہ استدلال ہر ذی شعور تسلیم کرے گا اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس کا استدلال اس لئے معتبر نہیں کیونکہ یہ اخبار کا ترجمہ ہے اور مترجم اگرچہ زبان میں پوری مہارت رکھتا ہے اور دانستہ طور پر جھوٹ بھی نہیں لکھ سکتا لیکن اس کے فہم میں غلطی ہو سکتی ہے تو اس شخص کی بات کوئی عقلمند تسلیم نہیں کرے گا۔

مثال نمبر2: اگر آج کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ150ھ) کے کلام کا مطلب جو امام محمد رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ189ھ)، امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ182ھ) اور امام زفر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ158ھ) وغیرہ بیان کرتے ہیں وہ غلط ہے اور صحیح مطلب یوں ہے، یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مطلب ان کے شاگردوں نے غلط سمجھا ہے جبکہ صحیح یوں ہے۔ تو کیا ایسے شخص کی عقل پر ماتم نہ کیا جائے گا؟ مگر افسوس کہ اگر ایسی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں کی جائے تو کسی کو پرواہ نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علوم عربیہ یعنی نحو، صرف، معانی، بیان وغیرہ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں یا پھر پرانے عربوں کے ادب سے، کیونکہ یہ علوم استقرائی ہیں اور استقرائی علم وہ ہوتا ہے جسے جزئیات سے اخذ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان علوم میں قرآن و حدیث اور عربِ اُول کی نثر و نظم کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ بات بھی مسلم ہے کہ قرآن و حدیث یا عربِ اوّل کے کلام سے علومِ عربیہ کو اخذ کرنا تبھی ممکن ہے جب ان اصول ثلاثہ کو صحیح طور پر سمجھا جائے بالخصوص علم بلاغت کے مسائل اخذ کرنے میں تو متکلم کی مراد کا پوری طرح ادراک اور فہم ضروری ہے کیونکہ اس علم میں بنیادی طور پر بحث ہی اس بات پر ہوتی ہے کہ متکلم کو اپنا مافی الضمیر کس طرح ادا کرنا چاہئے، کلمات کس قسم کے استعمال کرے اور کلمات کو باہم ربط کیونکر دے؟

الغرض ثابت یہ ہوا کہ علومِ عربیہ دراصل ائمہ لغت کی درایت تفسیری کے تابع ہیں، چنانچہ علومِ عربیہ کو ماننا اور قرآن و حدیث یا عربِ اوّل کے کلام کا صحیح مطلب جاننے کیلئے ان کو بطور دلیل پیش کرنا علمائے لغت کی درایت تفسیری کو ماننے کا بیّن ثبوت ہے۔

علومِ عربیہ کو ماننا اور قرآن و حدیث کا صحیح مطلب سمجھنے میں ائمہ لغت کی درایت تفسیری کو بطور دلیل پیش کرنا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درایت تفسیری کو حجت نہ ماننا نہایت افسوسناک امر ہے اور یہ رویہ اس بات پر غماز ہے کہ منکرین حجیت تفسیر صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اہل زبان ہونے کے باوجود اہل زبان کے برابر بھی لغتِ عرب میں مہارت نہیں رکھتے تھے۔

حالانکہ علوم عربیہ کا معیار فہم عرب اول ہے، جو مسئلہ ان کے فہم کے مطابق ہو وہ صحیح ہے اور جو خلاف ہو وہ غلط۔ یہ علوم تو کئی برس کے بعد مدوّن ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان سے وہیں تک استدلال درست ہے جہاں تک فہم عرب اول کے خلاف نہ ہوں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی 1176ھ) فرماتے ہیں:

"وأما لغة القرآن فينبغي أخذها من استعمال العرب الأول ولكن الاعتماد الكلّي على آثار الصحابة والتابعين، وقد وقع في نحو القرآن خلل عجيب وذلك أن جماعة منهم اختاروا مذهب سيبويه، وما لم يوافقه فهم يؤوّلونه وإن كان تأويلًا بعيدا، وهذا عندى غير صحيح فينبغي اتّباع الأقوى وما كان أوفق للسّياق والسّباق سواء كان مذهب سيبويه أو مذهب الفرّاء... وأما المعاني والبيان فهو علم حادث بعد انقراض الصّحابة والتّابعين فما يفهم منه في عرف جمهور العرب فهو على الرّأس وما كان من أمر خفي لا يدركه إلا المتعمّقون من أهل الفنّ فلا نسلم أن يكون مطلوبا في القرآن."[1]

"لغت قرآن کو عرب اول کے محاورات سے اخذ کرنا چاہئے لیکن مکمل اعتماد بہر حال آثار صحابہ و تابعین پر ہی ہے۔ اور قرآنِ مجید کی نحو میں عجیب خلل واقع ہوا ہے وہ یوں کہ بعض لوگوں نے سیبویہ (180ھ) کے مذہب کو اختیار کر لیا پھر جو لفظ مذہبِ سیبویہ کے خلاف آئے اس کو تاویل کر کے سیبویہ کے موقف کے مطابق بناتے ہیں خواہ وہ دور از صواب ہی کیوں نہ ہو۔ یہ انداز میرے نزدیک درست نہیں، بلکہ چاہئے تو یہ کہ موقف زیادہ قوی اور سیاق و سباق کے مطابق ہو، اسی کی اتباع کی جائے خواہ وہ سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہو یا فراء (متوفی 207ھ) کا۔... جہاں تک معنی و بیان کا تعلق ہے تو یہ علوم صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے بعد وجود میں آئے ہیں لہٰذا ان علوم میں سے جو چیز جمہور عرب کے عرف میں سمجھی جاتی ہو اسے ہم قبول کرتے ہیں اور جس کو صرف ماہر اہل فن سمجھتے ہیں وہ ہمارے ہاں مقبول نہیں اور نہ ہی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بھی قرآن مجید میں مطلوب ہے۔"

قرآنِ مجید کو سمجھنے کیلئے صرف لغت کافی نہیں بلکہ حدیث نبوی اور تفسیر صحابہ کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بعض اوقات لغت میں کسی لفظ کا معنی کچھ اور ہوتا ہے جبکہ شریعت میں اس سے کچھ اور مراد ہوتا ہے مثلاً لغت میں صوم کا معنی ہے: رُکے رہنا۔ حج کا معنی: قصد کرنا، لفظ "صلوۃ" کا معنی "تحريك الصّلوين" یعنی کولہے ہلانا۔ یا دُعا لکھا ہوا ہے، جبکہ اصطلاحِ شریعت میں ان سے مراد مخصوص ارکان کی ادائیگی ہے چنانچہ اگر ہم صرف لغت پر اکتفا کریں تو ایک بھی شرعی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ان الفاظ کے جو معانی شریعت میں مراد ہیں وہ بھی لغت میں لکھے ہوئے ہیں مثلاً "صلوۃ" کے معنی 'ارکانِ مخصوصہ' جو شریعت نے بتلائے ہیں، وہ قاموس میں لکھے ہوئے ہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ ان الفاظ

---

[1] الدهلوي، شاه ولي الله، أحمد بن عبد الرحيم، الفوز الكبير في أصول التفسير: ص189-190، دار الصفوة، القاهرة، الطبعة الثانية، 1986م

کے معانی لغت اور شرع میں مختلف ہیں، غلط ہے۔ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ کسی بھی اصطلاح کا علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک خود اہل اصطلاح بیان نہ کریں مثلاً ماضی، مضارع، اسم فاعل اور اسم مفعول علم الصرف کی اصطلاحات ہیں۔ فاعل، مفعول، حال اور تمیز وغیرہ علم نحو کی اصطلاحات ہیں۔ محکوم علیہ، محکوم فیہ اور نسبت خبریہ وغیرہ علم منطق کی اصطلاحات ہیں۔ بالکل اسی طرح صلوٰۃ، زکوٰۃ اور وضو وغیرہ شریعت کی اصطلاحات ہیں۔ ان تمام اصطلاحات کے علم میں ہم اہلِ فن کے محتاج ہیں، لہٰذا اگر صاحبِ قاموس صلوٰۃ کے معنیٰ" عبادة فيها ركوع وسجود "(ایسی عبادت جس میں رکوع وسجود ہوں) یا زکوٰۃ کا معنیٰ" ما أخرجته من مالك لتطهّره "(وہ حصہ جو آپ اپنے مال کو پاک کرنے کیلئے اس میں سے نکالیں) یا وضو کا معنیٰ" التوضّي للصلوة "(نماز کیلئے پاکیزگی حاصل کرنا) لکھ بھی دیں تو بھی ہم احادیثِ نبویہ اور اقوالِ صحابہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتے کیونکہ صاحبِ قاموس نے خود یہ معانی اہلِ شریعت سے ہی لے کر لکھے ہیں۔ گویا دراصل یہ معانی حدیثِ نبوی اور اقوالِ صحابہ سے ہی ماخوذ ہیں۔ اسی لئے ایسے الفاظ کو منقولاتِ شرعیہ کہا جاتا ہے۔

اگر ہم اس بات کو نظر انداز بھی کر دیں کہ لغت والے نے یہ معانی اہل شرع سے ہی اخذ کئے ہیں تب بھی ہم صرف لغت پر اعتماد نہیں کر سکتے کیونکہ صاحبِ قاموس کے بیان کردہ یہ معانی اصطلاحِ شرع کے حوالے سے ناقص ہیں جیسا کہ صاحبِ قاموس نے 'صلوٰۃ' کا معنیٰ کیا کہ ایسی عبادت جس میں رکوع وسجود ہو۔ حالانکہ نماز کے صرف یہی دو ارکان نہیں ہیں بلکہ قیام، قراءت، تشہد، تکبیر تحریمہ، تسلیم یہ سب ارکان نماز ہیں جنہیں صاحبِ قاموس نے بیان ہی نہیں کیا۔ یہی حال باقی اصطلاحات کی لغت میں موجود تعریفات کا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ قرآنِ مجید کا سمجھنا صرف کتب لغت کی ورق گردانی سے ممکن نہیں۔

علاوہ ازیں بعض اوقات لغت میں ایک لفظ کے کئی معانی لکھے ہوتے ہیں، مثلاً صلوٰۃ کے معانی دُعا اور کولہوں کو حرکت دینا، دونوں لغت میں موجود ہیں تو ایسی صورت میں یہ جاننا کیونکر ممکن ہے کہ قرآن کریم کی آیتِ مبارکہ ﴿ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ﴾ میں کون سا معنیٰ مراد ہے؟ اسی طرح زکوٰۃ کا معنیٰ لغت میں مطلق طور پر پاک کرنا ہے۔ تو ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ ﴿ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ﴾ کے حکم قرآنی میں نفس کو آلائشوں سے پاک کرنا مقصود ہے یا مال کو پاک کرنا۔

الغرض ایسے الفاظ جن کے ایک سے زیادہ معانی لغت میں موجود ہوں، ان میں کسی ایک معنیٰ کا تعین اور باقی معانی پر اس کو ترجیح دینا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی سببِ ترجیح نہ پایا جائے۔

بالفرض اگر کسی بناء پر ہم ایک معنیٰ کو ترجیح دے کر متعین کر بھی لیتے ہیں تو اس پر ایک اور اشکال وارد ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی مرجح کی بناء پر معنیٰ متعین کرنے سے آیت مؤول ہو جائے گی اور مؤول کی اپنے معنیٰ پر دلالت ظنی ہوتی ہے جیسا کہ کتبِ اصول میں ہے:

"ثم إذا ترجّح بعض وجوه المشترك بالغالب الرّأي يصير مؤوّلا وحكم المؤوّل

وجوب العمل مع احتمال الخطإ." [1]

"ایک سے زیادہ معنی رکھنے والے لفظ کے کسی ایک معنی کو جب ظن غالب کی بنیاد پر ترجیح دی جائے تو اس کو مؤوّل کہتے ہیں اور مؤول پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے لیکن اس میں غلطی کا امکان بھی بہر حال رہتا ہے۔"

چنانچہ صلوٰۃ کا معنی "عبادة فيها ركوع وسجود" اور زکوٰۃ کا معنی "ما أخرجته من مالك لتطهرّه" بھی حتمی نہیں ہوگا، نتیجتاً ان معانی کا انکار کرنے والے کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ ان کا انکار فقط ایسے ہوگا جیسے کسی مجتہد کی رائے کا انکار کر دیا جائے۔ اور اس نتیجے کا باطل ہونا واضح ہے۔

بلاشبہ ہم عربی زبان کو صرف ونحو، اُصول، معانی اور بیان وغیرہ کے قواعد کی مدد سے ہی سمجھتے ہیں اور یہ قواعد قرآن وحدیث اور ادبِ عربی سے ماخوذ ہیں کیونکہ یہ استقرائی علوم ہیں اور استقرائی علوم جزئیات کی بحث وتحقیق سے ہی وجود میں آتے ہیں۔

علومِ عربیہ کے یہ قواعد ائمہ لغت نے اخذ کیے ہیں مثلاً آیت: ﴿ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ﴾ [2] سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس عورت کا خاوند فوت ہو جائے، خواہ وہ حاملہ ہو، اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے جبکہ دوسری آیت ﴿ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ [3] سے پتہ چلتا ہے کہ ایسی عورت کی عدت وضع حمل ہے۔ چنانچہ سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت دوسری آیت کے ساتھ منسوخ ہے۔

لہٰذا عدت وضع حمل ہی ہوگی جبکہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک عورت ان دونوں عدتوں میں سے وہ عدت اختیار کرے گی جس کی مدت زیادہ لمبی ہو کیونکہ دونوں آیتوں میں بظاہر ٹکراؤ پیدا ہو رہا ہے اور ایسی صورت میں احتیاط پر عمل کرنا ہی بہتر ہوتا ہے اور احتیاط اسی میں ہے کہ زیادہ مدت والی عدت گزاری جائے۔ [4]

الغرض ان دونوں آیتوں میں عموم پایا جاتا ہے چنانچہ سیدنا علی اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم دونوں نے ان آیتوں کو عموم پر ہی باقی رکھا۔ علمائے اصول نے جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر اہلِ لغت کو دیکھا کہ وہ عمومات سے استدلال کرتے ہیں تو یہ قاعدہ وضع کر دیا کہ

"عام اپنے تحت آنے والی تمام جزئیات کا احاطہ کئے ہوئے ہوتا ہے، خواہ یہ جزئیات اس لفظ کے تحت ظنی طور پر داخل ہوں یا قطعی اور یقینی طور پر۔"

اسی طرح جب علمائے معانی نے دیکھا کہ قرآن وحدیث اور دیگر اہل زبان جب کسی بات سے انکار کرنے

---

[1] الشاشي، نظام الدين أبو علي، أصول الشّاشي: ص39 ، دار الكتب العلمية، سنة النشر، 2003م

[2] سورة البقرة: 2 : 234

[3] سورة الطلاق: 65 : 4

[4] جامع البيان: 23 / 454

والے سے گفتگو کرتے یا کسی سوال کا جواب دیتے ہیں تو اپنی گفتگو میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے کلام میں تاکید پیدا ہو جائے، تو انہوں نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ

"کل حکم یخاطب به المنکر أو السّائل یجب توکیده أو یستحسن."

"جب کسی بات کا انکار کرنے والے یا کسی چیز کے متعلّق سوال کرنے والے کے ساتھ گفتگو کی جائے تو تاکید کے انداز میں بات کرنا واجب یا کم از کم ایک مستحسن اَمر ہے۔"

الغرض ائمہ لغت نے الفاظ و معانی کے متعلّق ہزار ہا قواعد وضع کئے اور یہ تمام قواعد قرآن و حدیث اور عربوں کی بول چال سے ہی اخذ کئے ہیں۔ اس تمام بحث کا مقصود یہ ہے کہ چونکہ قواعدِ عربیہ ائمہ لغت کے استنباط اور استدلال کا نتیجہ ہیں لہٰذا اس استنباط میں غلطی کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے قواعدِ لغویہ میں ائمہ لغت کا باہم اختلاف بھی موجود ہے۔

بایں ہمہ صحابہ کی درایت تفسیری کی حجیت کے منکرین ان قواعدِ عربیہ سے استدلال کرتے ہیں اور انہیں بطور دلیل بھی پیش کرتے ہیں اور ان قواعد کی بنیاد پر اہل زبان (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے بیان کردہ معانی کو رد بھی کرتے ہیں۔

قواعدِ عربیہ کی بنیاد پر اہل زبان کے کلام کو غلط کہنا اس لئے بھی درست نہیں کہ قواعدِ عربیہ جس طرح اپنی وضع میں غلطی سے محفوظ نہیں اسی طرح اپنے استعمال میں بھی کجی سے مُبرا نہیں۔ یعنی جس طرح ان قواعد کے استنباط میں غلطی ہو سکتی ہے اسی طرح ان کے بر محل استعمال کرنے میں بھی غلطی ہو سکتی ہے کیونکہ یہ قواعد کلیات (Formulas) ہیں اور ان کلیات کو جزئیات پر منطبق (Apply) کرتے وقت انسان بسا اوقات غلطی کر جاتا ہے۔

علاوہ ازیں قواعدِ عربیہ کی بناء پر فصیح اللّسان عربوں کے کلام کو اس لئے بھی غلط قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اگر بالفرض مان لیا جائے کہ قاعدہ کے استنباط میں غلطی واقع نہیں ہوئی لیکن یہ امکان پھر بھی باقی رہتا ہے کہ ہو سکتا ہے قاعدہ محفوظ نہ رہا ہو یا اگر محفوظ بھی رہا ہو تو انطباق (Application) کے وقت لاگو کرنے والے کو اچھی طرح یاد نہ ہو۔

ان تمام وجوہات کے پیش نظر ہم یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ قواعدِ عربیہ ہر گز یہ حق نہیں رکھتے کہ ان کی بنیاد پر خود اہل زبان کے کلام کو غلط قرار دیا جاسکے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درایت تفسیری پر طعن کیا جاسکے۔

یوں بھی قواعد تو غیر اہل زبان کیلئے وضع کئے گئے ہیں نہ کہ اہل زبان کیلئے۔ لہٰذا قواعد کی پابندی صرف غیر اہل زبان پر لازم ہے۔ فصحائے عرب میں سے اگر کسی کے کلام میں قاعدہ کی مخالفت پائی جائے تو اس کلام کو غلط نہیں کہا جائے گا بلکہ حتی الامکان اس کی قاعدے کے ساتھ موافقت پیدا کی جائے گی یا کوئی مناسب تاویل کی جائے گی یا زیادہ سے زیادہ اس کلام کو شاذ کہہ دیا جائے گا۔ الغرض اہل زبان کو قواعد کے تابع نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قواعد تو خود انکے کلام سے ماخوذ ہیں بلکہ قواعد کو انکے تابع کیا جائے گا۔

علومِ عربیہ کے قواعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور دیگر اہل زبان کے محاورے اور اس محاورے سے ان کی مراد اور فہم کو سامنے رکھ کر بنائے گئے ہیں، اور قرآنِ مجید بھی ان کے محاورات میں سے ایک محاورہ ہے۔ اگر قرآنِ مجید میں ان کے فہم کا اعتبار نہیں کیا جاتا تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان قواعد کا بھی اعتبار نہ کیا جائے جو ان کے محاورے سے اخذ کئے گئے ہیں اور اگر ان قواعد کو مانا جاتا ہے تو عدل یہی ہے کہ قرآنِ کریم میں بھی ان کے فہم کو تسلیم کیا جائے۔

قواعدِ عربیہ قرآن مجید، حدیث مبارکہ اور دیگر اہل زبان کے محاورات سے مستنبط ہیں اور استنباط کیلئے یہ ضروری ہے کہ جس حدیث، آیت یا شعر سے قاعدہ اخذ کیا جائے، پہلی اچھی طرح اس کا مطلب سمجھا جائے۔ مثال کے طور پر ہم آیت مبارکہ:

﴿ وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ۝ ﴾[1] سے یہ قاعدہ اَخذ کرتے ہیں کہ کبھی کبھی کسی شخص کے ساتھ سائل کے جواب کے انداز میں خطاب کیا جاتا ہے باوجودیکہ اس نے سوال نہیں کیا ہوتا۔ تو اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ہمیں اس آیتِ مبارکہ کا مفہوم اور مطلب معلوم ہو۔

اب جو شخص ان قواعد کو مانتا ہے، اسے واضعینِ قواعد کی درایت تفسیری پر اعتماد ہونا چاہئے۔ الغرض جب واضعین قواعد کی درایت تفسیری حجّت ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درایت تفسیری کی حجیت پر اس سے بڑھ کر اعتماد ہونا چاہئے کیونکہ وہ عرب اُول تھے اور قرآنِ مجید عرب اول کے محاورے کے مطابق نازل ہوا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درایت تفسیری سب سے مقدّم ہے، ہاں البتہ اگر کوئی اس سے قوی دلیل مل جائے تو اس کو چھوڑا جاسکتا ہے۔

حرفِ آخر

چنانچہ قرآنِ کریم کے ظاہری الفاظ کا جو مفہوم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم کے مطابق ہو، وہ صحیح ہے اور جو خلاف ہو وہ غلط۔ اس لیے کہ جن علوم کی بنیاد پر محاورۂ صحابہ سے اعراض کیا جاتا ہے وہ علوم تو کئی برس کے بعد مدون ہوئے ہیں، ان سے وہیں تک استدلال صحیح ہے، جہاں تک ان کے فہم کے خلاف نہ ہو۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وأما لغة القرآن فينبغي أخذها من استعمال العرب الأول ولكن الاعتماد الكلّي على آثار الصحابة والتابعين، وقد وقع في نحو القرآن خللٌ عجيب وذلك أن جماعة منهم اختاروا مذهب سيبويه، وما لم يوافقه فهم يؤوّلونه وإن كان تأويلًا بعيدا، وهذا عندى غير صحيح فينبغي اتّباع الأقوى وما كان أوفق للسّياق والسّباق سواء كان مذهب سيبويه أو مذهب الفرّاء... وأما المعاني والبيان فهو علم حادث بعد انقراض الصّحابة والتّابعين فما يفهم منه في عرف جمهور العرب فهو

[1] سورة هود: 11 : 37

على الرّأس وما كان من أمر خفي لا يدركه إلا المتعمّقون من أهل الفنّ فلا نسلم أن يكون مطلوبا في القرآن."[1]

"لغت قرآن کو عرب اول کے محاورات سے اخذ کرنا چاہئے لیکن مکمل اعتماد بہر حال آثار صحابہ و تابعین پر ہی ہے۔ اور قرآنِ مجید کی نحو میں عجیب خلل واقع ہوا ہے وہ یوں کہ بعض لوگوں نے سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب کو اختیار کر لیا پھر جو لفظ مذہبِ سیبویہ کے خلاف آئے اس کو تاویل کر کے سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ کے موقف کے مطابق بناتے ہیں خواہ وہ دور از صواب ہی نہ ہو۔ یہ انداز میرے نزدیک درست نہیں، بلکہ چاہئے تو یہ کہ موقف زیادہ قوی اور سیاق و سباق کے مطابق ہو، اسی کی اتباع کی جائے خواہ وہ سیبویہ کا مذہب ہو یا فراء رحمۃ اللہ علیہ کا۔... جہاں تک معنی و بیان کا تعلق ہے تو یہ علوم صحابہ رضی اللہ عنہم و تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے بعد وجود میں آئے ہیں لہٰذا ان علوم میں سے جو چیز جمہور عرب کے عرف میں سمجھی جاتی ہو اسے ہم قبول کرتے ہیں اور جس کو صرف ماہر اہل فن سمجھتے ہیں وہ ہمارے ہاں مقبول نہیں اور نہ ہی ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بھی قرآن مجید میں مطلوب ہے۔"

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس واضح بیان سے قواعد عربیہ و لغتِ عرب کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور ان علوم کی اصل حقیقت واضح ہو جاتی ہے لیکن تفسیر میں لغت کو حدیث مبارکہ اور اقوال صحابہ پر فوقیت دینا معتزلہ کا موقف ہے اس لئے کہ معتزلہ تفسیر قرآن کے سلسلہ میں عربی لغت کو اصل اوّلین اساس قرار دیتے ہیں۔

الحاصل

تفسیر کے سلسلہ میں علومِ عربیہ کی اہمیت و ضرورت ماننا اور قرآن و حدیث کا صحیح مطلب سمجھنے میں ائمہ عربیہ کی درایتِ تفسیری سے بطور استدلال مدد لینا لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درایت تفسیری کو نہ ماننا اور انکار کرنا قابلِ افسوس ہے۔ گویا ان کے نزدیک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم باوجود اہل زبان ہونے کے، اپنی زبان میں مہارت نہیں رکھتے تھے کیونکہ جب علومِ عربیہ ائمہ لغت کی درایت تفسیری کے تابع ہیں، پس علومِ عربیہ کو ماننا اور قرآن و حدیث یا عرب اُول کی کلام کا صحیح مطلب سمجھنے میں بطور استدلال ان علوم سے کام لینا گویا ائمہ لغت کی درایتِ تفسیری کو ماننا ہے اور اس سے بطور استدلال کام لینا ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی درایت تفسیری کا انکار قابلِ تعجب ہے۔

[1] الفوز الكبير: ص189-189